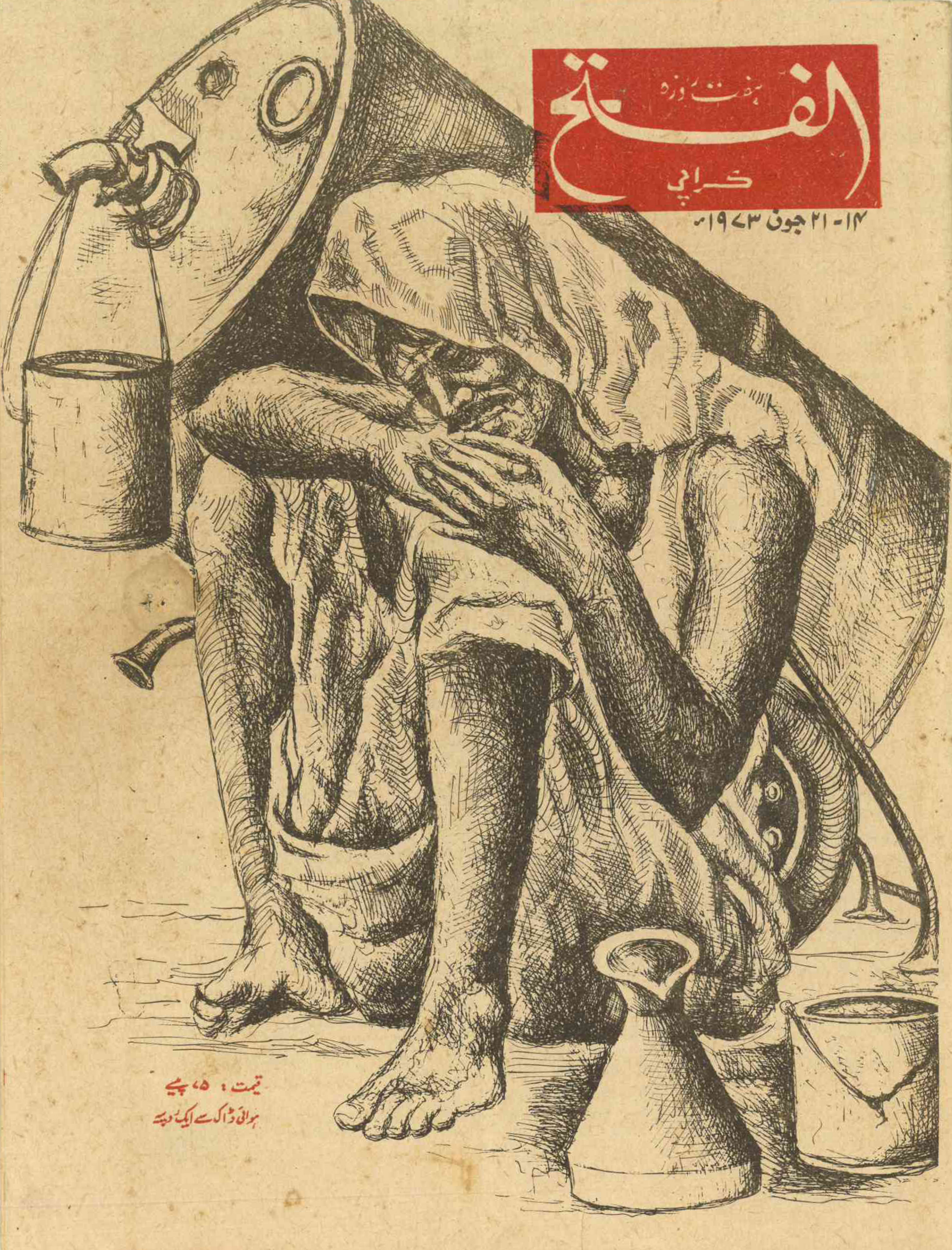
ہفت روزہ
الفتح
کراچی
۱۴-۲۱ جون ۱۹۷۳ء



قیمت : ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے ایک روپیہ

حق بات کہنے والے ملک کا بہت بڑا سرمایہ ہیں!

ایڈیٹر "الفتح" کے نام پروفیسر غفور کا خط

آپ کا تار ملا۔ یہ میرے لئے غیر متوقع نہیں۔ حکومت کسی اختلاف رائے کو برداشت کرنے کے لئے خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ کیوں نہ ہو، ہرگز تیار نہیں معلوم ہوتی۔ کیا اندھیر ہے کہ صحافت کی آزادی کے سب سے بڑے علمبردار اس پر یہ ظلم ڈھا رہے ہیں جس کی مثال دورِ غلامی میں بھی نہیں ملتی۔

میں نے اس سلسلے میں سوال بھیج دیا ہے۔

میں آپ کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ میرے نزدیک وہ تمام لوگ ملک کا بہت بڑا سرمایہ ہیں جو جرأت کے ساتھ بات کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں چاہے وہ میرے اور میری جماعت کے سخت مخالف ہوں۔

مجھے توقع ہے کہ آپ حوصلہ سے کام لیں گے۔ یہ دن بھی نہیں رہیں گے۔ انشاءاللہ ہم جلد صحافت کو وہ مقام دلانے میں کامیاب ہوجائیں گے جس کی یہ مستحق ہے۔

والسلام

غفور احمد



ہفت روزہ الفتح کا

نیوز پرنٹ کوٹہ بحال کیا جائے

مزدور اور طلبہ تنظیموں کا مطالبہ -!!

پاکستان گیس ایمپلائز فیڈریشن کے سیکرٹری جنرل اے، ایچ شیرازی نے ایک اخباری بیان میں ہفت روزہ "الفتح" کے نیوز پرنٹ کے کوٹہ کی منسوخی پر حکومت کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہفت روزہ الفتح مزدوروں اور مظلوم عوام کا ترجمان ہے۔ اس نے پاکستانی محنت کشوں کی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ آزادیٔ صحافت کی علمبرداری میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ درحقیقت "الفتح" کی تنقید کا مقصد حکومتِ وقت کی اصلاح کرنا ہے۔ لیکن حکومت نے اپنی اصلاح کرنے کی بجائے مزدوروں کے ترجمان "الفتح" کو دبانے کے لئے اس کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ منسوخ کر دیا۔

مسٹر شیرازی نے تمام محبِ وطن، جمہوریت پسند، ترقی پسند اور انقلابی دوستوں سے اپیل کی ہے کہ وہ حکومت کے اس جمہوریت کُش اقدام کے خلاف سخت احتجاج کریں اور حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ الفتح کا کوٹہ بحال کرے۔

کراچی معمار مزدور یونین کی ایک قرارداد میں ہفت روزہ الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ مکمل طور پر منسوخ کرنے پر حکومت کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ غریبوں محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں کی آواز اٹھانے والے اس واحد جریدہ پر وقتاً فوقتاً حکومت کا عتاب نازل ہوتا رہتا ہے۔ پہلے اس کے نیوز پرنٹ کے کوٹہ میں کمی کر دی گئی اور سرکاری اشتہارات بند کر دیئے گئے اور اب نیوز پرنٹ کا کوٹہ مکمل طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے تاکہ ہفت روزہ "الفتح" معاشی دشواریوں کا شکار ہو کر بند ہو جائے۔ قرارداد میں حکومت کے اس اقدام کو غیر جمہوری اور آزادیٔ صحافت کے منافی قرار دیتے ہوئے الفتح کے نیوز پرنٹ کوٹہ کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اور الفتح کے کارکنوں کو مکمل حمایت اور تعاون کا یقین دلایا گیا ہے۔

عامل صحافی خوشنویس یونین کی مجلس عامہ کی ایک قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ہفت روزہ الفتح کے نیوز پرنٹ پر عائد شدہ پابندی فوری طور پر ختم کر دے۔

مشہور طالب علم رہنما اور اردو کالج کے سابق صدر عبدالطیف شمع نے الفتح کے نیوز پرنٹ کوٹہ کی منسوخی پر شدید احتجاج کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نوکر شاہی اس قسم کے اقدامات سے عوامی حکومت کو بدنام کر رہی ہے۔

انجمن اتحادِ طلبہ گورنمنٹ اردو کالج کے صدر ظہور احمد ڈھلو نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ہفت روزہ الفتح کا نیوز پرنٹ کوٹہ بحال کیا جائے۔ انہوں نے کہا ہے کہ مزدوروں اور دانشوروں کے ترجمان "الفتح" کا کوٹہ منسوخ کرنے سے عوامی حلقوں میں تشویش پیدا ہو گئی ہے حکومت کو چاہیئے کہ وہ صحافت کو پابندِ سلاسل نہ کرے۔

پاکستان نیشنل ڈیموکریٹ کے صدر ظفر علی سیّد نے ایک اخباری بیان میں کہا ہے کہ حکومت کو عوامی جریدوں پر پابندی لگانے سے گریز کرنا چاہیئے۔ "الفتح" مظلوم طبقہ کا ترجمان ہے۔ اس کے نیوز پرنٹ کوٹہ کی منسوخی سے عام طور پر یہ تاثر لیا جا رہا ہے کہ حکومت "الفتح" کو بند کرنا چاہتی ہے۔ لہٰذا حکومت کو چاہیئے کہ وہ "الفتح" کا نیوز پرنٹ کوٹہ فوری طور پر بحال کرے۔

---

۳۰ مئی ۱۹۷۳ء کے روزنامہ "امن" میں ہفت روزہ الفتح کے نیوز پرنٹ کوٹہ کی منسوخی کی خبر پڑھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔

(باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

مدیر
وہاب صدیقی

۱۴ - ۲۱ جون ۱۹۷۳ء
قیمت : ـــــ ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ

الفتح
کراچی

جلد : ۴ شمارہ : ۵

ادارئیے

جدوجہد آخری فتح تک

کسان بستی مکمل طور پر خوف وہراس کی لپیٹ میں ہے، بجھے بجھے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں، نا امیدی ہے، پریشانی ہے، گھٹن ہے، گھُپ اندھیرا ہے ہر گھر سے آواز بلند ہو رہی ہے، روشنی! روشنی!! روشنی!!!

نمبردار کارندے روشنی نہیں چاہتے۔ وہ ربع صدی سے اندھیروں کے دیوتا بنے ہوئے ہیں، ان کا کام چراغوں کو گل کرنا ہے۔ کسان بستی میں ان اجیالوں کے ان گنت مدفن بنا دیئے گئے جنہوں نے اندھیروں کے خلاف آواز بلند کی۔

کسان بستی والوں کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب حسن ناصر روشنی کی کرن بن کر ابھرے تو تاریکی کے محافظوں نے انہیں جا لیا، وہ حسن ناصر پر حاوی ہوگئے اور اُن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد حسن ناصر کا راستہ جس کسی نے اپنایا اس کا مقدر مقتل ٹھہرا۔

ہاں! ایک دَور ایسا آیا جب بستی کے تمام لوگ حسن ناصر کے قاتلوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر گلی، ہر کوچے، ہر کارخانے اور ہر کھلیان میں آوازیں

خاص مضامین

سرورق : اقبال مہدی
عکاس : گرینگو
فون : ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸ ڈی۔ نرسری کمرشل ایریا پی۔ ای سی۔ ایچ۔ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا۔

گونجیں "حسن ناصر کا راستہ، ہمارا راستہ"، "مانگ رہا ہے ہر انسان، روٹی کپڑا اور مکان"، "روٹی کپڑا سب کو دو، ورنہ گدی چھوڑ دو" ایک طوفان تھا - اندھیرے کے خلاف روشنی کی یلغار تھی -

تاریکی کے رکھوالوں نے اپنی پوری طاقت جھونک دی۔ ماؤں سے بیٹوں کی قربانی مانگی۔ بیویوں سے سہاگ مانگا، بہنوں سے بھائیوں کے سر مانگے۔ بوڑھے باپ سے جوان بیٹے کا لہو طلب کیا۔ کسی نے انکار نہ کیا۔ روشنی کے طلبگاروں نے تاریکی کے دیوتا کی بھینٹ اپنی متاعِ عزیز چڑھا دی۔

ان دنوں بستی کے ایک بڑے جاگیردار کے بیٹے نے مظلوموں کو اپنایا ایک نئی صبح کے قائد کی حیثیت سے بستی والوں نے اس نوجوان کو منتخب کر لیا۔ سب نے کہا "تم ہمارے نمبردار ہو، آگے بڑھو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہر قسم کی قربانی دیں گے، تمہارا پروگرام روشنی اور اجالوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ بستی والوں نے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کر دکھایا۔ انہوں نے حسن ناصر کے قاتلوں کے خلاف جنگ جیت لی۔

نئے نمبردار سے بستی والوں کی امیدوں کا اندازہ ان قربانیوں سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے جدوجہد کے دوران دیں۔ اندھیرے کے دیوتاؤں نے بھی شروع میں یہی تاثر لیا کہ اب ان کی دال نہ گلے گی، نیا دور آ گیا ہے، اُن کی خیر نہیں یہ تاثر زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اندھیرے کے دیوتاؤں نے متحد ہو کر نمبردار کو گھیر لیا۔ بستی والے دیکھتے ہی رہ گئے روشنی مدھم پڑنے لگی، جدھر دیکھو، اندھیرے کے دیوتا کا راج ہے۔ اس کی حکمرانی ہے۔

بستی کے نوجوانوں نے کہا کہ یہ سب کچھ ہماری لاشوں پر ہو گا، اندھیرا روشنی کو ختم نہیں کرتا، شمع جلتی رہے گی، اسے اور خون دیں گے، یہ نوجوان آگے بڑھے، نمبردار کے کارندوں نے بھرپور وار کیا اور آن کی آن میں کئی جیالے شہید ہو گئے ہر جگہ اس عہد کو پورا کیا گیا، مگر اندھیرے کے رکھوالے باز آنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے سمندر پار سے کمک طلب کر لی ہے۔ آج بستی خوف و ہراس کی لپیٹ میں ہے۔ بستی والے مایوسی کے عالم میں دیکھ رہے ہیں کہ اُن کی آواز دبانے کا عمل شروع ہو چکا ہے کہا جا رہا ہے کہ اندھیروں کا ساتھ دو۔ روشنی کی بات کرو گے تو تمہارا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ شہید چوک کی بجائے کیٹرک ہال جاؤ۔ بستی والو! تم صرف شکاگو کے مزدوروں کا دن منا سکتے ہو شعیب شہید کی یاد میں آنسو بہانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ بستی والے سوچ رہے ہیں، یہیں سے تو آغاز سفر کیا تھا۔ کیا ہماری قربانیاں اکارت گئیں، اب ہماری بات بھی ناگوار گذرتی ہے' ہمارا گلا مت دباؤ، یاد کرو کہ یہ وہی آواز ہے جس نے تمہیں یہ دن دکھائے، ہماری آواز حق صداقت کی علمبردار ہے، اسے دبایا نہیں جا سکتا، دیکھو تمام بستی والے اس مایوسی، خوف و ہراس اور کٹھن مرحلے پر بھی یک زبان ہیں۔ سنو، وہ پکار رہے ہیں۔

الفتح ، الفتح ، الفتح -

جدوجہد آخری فتح تک -

احوال واقعی

واقفِ حال

ایک بار پھر

جاگیرداروں اور وڈیروں کو زرعی ٹیکس سے بچا لیا گیا

۱۹۷۳-۷۴ء کے مالی سال کا بجٹ ۹ جون کو قومی اسمبلی میں پیش کر دیا گیا۔ مرکزی وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن نے بتایا کہ آئندہ مالی سال کے دوران مرکزی حکومت کی خالص آمدنی کا اندازہ ۸ ارب ۵۰ کروڑ ۱۴ لاکھ روپیہ لگایا گیا ہے جب کہ اخراجات کا تخمینہ ۸ ارب، ۲ کروڑ ۴۸ لاکھ روپیہ ہے۔ اس طرح توقع ہے کہ آئندہ مالی سال میں ۲۲ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کی بچت ہو گی۔ بالفاظ دیگر یہ فاضل بجٹ ہوگا۔

اس بجٹ کے بارے میں مرکزی وزیر خزانہ کا دعویٰ ہے کہ یہ بجٹ ترقیاتی اور افراطِ زر کی روک تھام کرنے والا فاضل بجٹ ہے۔ مالیاتی بل اور مالیاتی ایکٹ کی عدم موجودگی میں وزیر خزانہ کے دعویٰ کا تجزیہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ کیونکہ بجٹ کی پوری تفصیلات ابھی بتائی نہیں گئیں اور نہ ہی بجٹ کی تقریر میں پیش کی گئی ہیں۔ بہرحال ابھی تک جو اعداد و شمار فراہم کیے گئے ہیں ان کے مطابق ۱۹۷۳-۷۴ء کے بجٹ کو افراطِ زر کی مکمل طور پر روک تھام کرنے والا بجٹ نہیں کہا جا سکتا۔ بجٹ میں سوتی دھاگے اور گرے کلاتھ، کاٹن ولیسٹ اور خام اُون وغیرہ کی برآمدی ڈیوٹی میں اضافہ کا اعلان کیا گیا ہے۔ برآمدی ڈیوٹی میں اضافہ کی وجہ سے سوتی دھاگے اور ان اشیاء کی درآمد میں کمی واقع ہونیکے امکانات ہیں اور توقع ہے کہ اندرونِ ملک سوتی دھاگے کی قیمت کم ہو جائے گی۔ سرمایہ دار اور صنعت کار سوتی دھاگہ برآمد کرنے کی بجائے اس کا کپڑا بنائیں گے۔ اس طرح پاکستان کی ٹیکسٹائل ملوں کی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ ملیں تینوں شفٹ چلیں گی، اس طرح روزگار میں اضافہ ہوگا۔ اندرونِ ملک سوتی کپڑے کی قیمت میں کسی حد تک کمی واقع ہو جائے گی، اس طرح افراطِ زر کو کسی حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ بجٹ میں کوئی اور اہم خصوصیت نظر نہیں آتی جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ یہ بجٹ افراطِ زر کی روک تھام کرے گا۔ حکومت کا یہ اقدام اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ مل مالکان اور صنعت کار اپنی مصنوعات کے نرخوں میں یکطرفہ اضافہ نہ کریں۔ بلکہ سوتی دھاگے کی قیمت میں کمی کے پیشِ نظر سوتی کپڑے کی قیمت میں بھی کمی کر دیں۔ لیکن مل مالکان اور صنعت کاروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سوتی دھاگے کی قیمت میں کمی ہونے کی وجہ سے سوتی کپڑے کی قیمت میں کمی کر دینگے، عبث اور حماقت ہے۔ ۲۵ سال کے تجربات شاہد ہیں کہ پاکستان میں اگر کسی قیمت میں ایک مرتبہ اضافہ ہو گیا تو اس میں کمی نہیں ہوتی، بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ خواہ خام مال کی قیمت میں کتنی ہی کمی کیوں نہ ہو جائے۔ اگر صنعت کاروں نے اپنی مصنوعات کی قیمتوں میں کمی نہ کی تو اس بجٹ سے نہ تو افراطِ زر پر قابو پایا جا سکے گا۔ اور نہ ہی مہنگائی کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ بجٹ میں درآمد شدہ اشیاء صرف پر سیلز ٹیکس کی شرح ۱۰ فیصد سے بڑھا کر ۲۰ فیصد کر دی گئی ہے۔ اس سے یقیناً درآمد شدہ اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا۔ حالانکہ پاکستانی کرنسی کی قیمت میں کمی ہونے سے درآمد شدہ اشیاء اور درآمد شدہ خام مال کے نرخوں میں پہلے ہی بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے۔ بجٹ میں یقین دلایا گیا ہے کہ سیلز ٹیکس کے اضافے سے خام اور نیم تیار شدہ اشیاء کی درآمد پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر ضروری اشیاء اور سامان تعیش کی درآمد پر مکمل طور پر پابندی کیوں نہیں لگا دی جاتی۔ اور انہیں درآمدی فہرست سے خارج کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ کیونکہ جب ان درآمد شدہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے تو ملکی صنعت کار اسی نوع کی ملکی مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں تاکہ درآمد شدہ اشیاء اور ملکی مصنوعات کے نرخ تھوڑے سے فرق سے یکساں سطح پر رہیں۔

پاکستان کی معیشت اور عوام کو جن بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ افراطِ زر اور روزمرہ کی اشیائے صرف کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہے۔ عوام الناس خواہ کسی شعبۂ حیات سے متعلق ہوں، مزدور ہوں یا کسان، نچلے درجہ کے ملازمین ہوں یا چھوٹے دکاندار، سب کا بجٹ اس بُری طرح سے متاثر ہوا ہے کہ ان کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے۔ یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں مزدوروں کی کم از کم اُجرت ۱۴۰ روپے ماہانہ مقرر کر دی گئی تھی۔ اوّل تو تمام اداروں میں اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ لیکن اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس قانون پر کلی طور پر عمل کیا گیا، اور سالانہ ترقی ۵ روپے کے حساب سے دی گئی تو ۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک کل تنخواہ ۱۶۵ روپے بنتی ہے۔ جبکہ گرانی میں اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ ۱۶۵ روپے کی قوتِ خرید ۱۹۶۹ء کے مقابلے میں ۱۰۰ روپے کے مساوی ہے۔ اس لئے وہ تمام لوگ جن کی تنخواہ مقرر ہے یا جن کی اُجرتوں میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا، گرانی کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔

بعض ماہرینِ معاشیات نے افراطِ زر کی تعریف یوں کی ہے —

"کہ جب بہت سا روپیہ چند اشیاء کا تعاقب کرے تو اشیاء کی کمیابی قیمتوں میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔"

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں اتنا بہت سا روپیہ کہاں سے آ گیا؟ یہ روپیہ کس کے پاس ہے؟ اور کیا عوام

اتنے ہی خوش حال ہو گئے ہیں کہ وہ بہت سا روپیہ خرچ کر لیں؟ اگر ہم بغور جائزہ لیں تو پاکستان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ عوام بدستور بھوک اور افلاس میں مبتلا ہیں۔ ان کی آمدنی میں اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ وہ سرکاری حکام جن کا انحصار رشوت پر ہے، ان کے اخراجات حد سے تجاوز کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے صنعت کار اور ملز مالکان جو ڈیوٹی ادا کئے بغیر سامان فیکٹری سے نکالتے ہیں، ٹیکس کی چوری کرتے ہیں، اور ناجائز کمائی ہوئی دولت کو بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ یہی وہ طبقات ہیں جو منہ مانگی قیمت ادا کر کے گرانی کو فروغ دیتے ہیں۔

افراطِ زر اور مہنگائی کے اسباب

افراطِ زر اور مہنگائی کی بہت سی وجوہات ہیں۔ چند اہم اسباب یہ ہیں۔ بغیر کسی مقصد کے کرنسی نوٹ چھاپنا، بجٹ میں ٹیکسوں کی بھرمار، صنعتی پیداوار میں کمی، ملکی کرنسی کی قیمت میں کمی کرنا، پاکستان میں مندرجہ بالا وجوہات افراطِ زر اور مہنگائی کا باعث بنیں۔

کرنسی نوٹوں کی چھپائی

پاکستان میں ۱۹۷۰-۷۱ میں کل کرنسی ۵۳۷ کروڑ روپے تھی۔ ۱۹۷۱-۷۲ میں یہ رقم بڑھا کر ۷۳۴ کروڑ روپے کر دی گئی۔ اور حال ہی میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق اب یہ رقم ۱۰۰۰ کروڑ روپے ہو گئی ہے۔ کرنسی کے اس پھیلاؤ نے قیمتوں پر بے پناہ دباؤ ڈالا ہے۔ لیکن ہمارے وزیرِ خزانہ کا کہنا ہے کہ "کرنسی کی اشاعت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔" حالانکہ اگر ۱۹۷۰ء سے پہلے چار سالوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان چار برسوں میں تقریباً ۹۵ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء سے دسمبر ۱۹۷۲ء تک تقریباً ۲۰۰ کروڑ روپیہ کا اضافہ کیا گیا۔ جو گزشتہ چار سال سے چار گنا زیادہ ہے۔ اگر یہ اضافہ شدہ رقم پیداواری شعبہ میں صرف کی جاتی، تو لوگوں کو روزگار ملتا، پیداوار میں اضافہ ہوتا اور اس طرح نہ تو افراطِ زر ہوتا اور نہ مہنگائی۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس اضافہ شدہ رقم کو غیر ترقیاتی منصوبوں پر لگایا گیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ۵۵ فیصد آبادی سے محروم ہو جانے کے بعد کرنسی کے پھیلاؤ میں کمی کی جاتی اور کم تعداد میں نوٹ چھاپے جاتے۔

خسارہ کا بجٹ

۱۹۷۲-۷۳ء کے ریونیو بجٹ میں تقریباً ۱۰۰ کروڑ روپے کا خسارہ دکھایا گیا۔ حالانکہ دو سال قبل پاکستان کا ریونیو بجٹ فاضل تھا۔ اس میں ۸۰ کروڑ روپے کی بچت دکھائی گئی تھی۔ حکومت نے اس خسارے کو پورا کرنے کے لئے صنعتی ٹیکس میں اضافہ کیا، کرنسی نوٹ چھاپے، جس کے نتیجہ میں ملک افراطِ زر اور مہنگائی کا شکار ہو گیا۔ اگر صنعتی ٹیکس میں اضافے اور کرنسی نوٹ کو زیادہ تعداد میں پھیلانے کی بجائے حکومت زرعی شعبہ پر ٹیکس لگاتی اور بڑی بڑی زمین داریوں پر زیادہ ٹیکس لگاتی تو خسارے کی رقم اس ذریعہ سے پوری ہو سکتی تھی۔

بجٹ - ایک نظر میں

کل آمدنی: ۹ ارب ۴۱ کروڑ ۹۵ لاکھ روپے

کسٹمز	۳ ارب ۱۲ کروڑ روپے
اکسائز	۲ ارب ۴۳ کروڑ روپے
انکم ٹیکس	۱ ارب ۵ کروڑ روپے
سیلز ٹیکس	۵۴ کروڑ روپے
دیگر سرچارج	۲۲ کروڑ ایک لاکھ روپے
سرمایہ کاری سے منافع	۱ ارب ایک کروڑ روپے
تجارتی منصوبوں سے	۱۵ کروڑ ۸ لاکھ روپے
سول انتظامیہ	۱۸ کروڑ ۱۸ لاکھ روپے
کرنسی اور ٹکسال	۱۰ کروڑ ۳۲ لاکھ روپے
دفاعی وصولی	۱۶ کروڑ ۶۷ لاکھ روپے
غیر معمولی وصولیاں	۴۰ کروڑ ۲۴ لاکھ روپے
متفرق	۱۹ کروڑ ۱۲ لاکھ روپے

غیر ترقیاتی اخراجات: ۸ ارب ۲۷ کروڑ ۸۴ لاکھ روپے

سود کی ادائیگی	۲ ارب ۱۷ کروڑ روپے
سول انتظامیہ	۴۷ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے
سود مند محکمے	۳۸ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے
صوبوں کی امداد	۲۶ کروڑ ۸۷ لاکھ روپے
دفاع	۴ ارب ۲۳ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے
جنگی بے گھروں کی آبادکاری	۳ کروڑ ۱۷ لاکھ روپے
دیگر اخراجات	۲۴ کروڑ ۷۷ لاکھ روپے

کل آمدنی: ۸ ارب ۵۰ کروڑ ۱۴ لاکھ روپے

اخراجات: ۸ ارب ۲۷ کروڑ ۸۴ لاکھ روپے

ترقیاتی پروگرام کے لئے بچت ۲۲ کروڑ ۶۶ لاکھ روپے

ترقیاتی اخراجات

آمدنی

وفاقی حکومت سے	۸۷ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے
(۱) آمدنی سے بچت	۲۲ کروڑ ۶۶ لاکھ روپے
(۲) سرمائے کی مد سے	۶۴ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے
(ا) نقد وصولی	۲ ارب ۴ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے
(ب) نقد ادائیگی	۱ ارب ۶۷ کروڑ روپے
بیرونی وسائل	۳ ارب ۳۰ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے
(۱) منصوبوں کیلئے امداد	۹۴ کروڑ ۹۹ لاکھ روپے
(۲) دیگر امداد	۲ ارب ۵ کروڑ ۴۳ لاکھ روپے
(۳) غذائی امداد	۳۰ کروڑ ۸ لاکھ روپے
وفاقی تنظیموں سے	۱۴ کروڑ ۶۵ لاکھ روپے

کل آمدنی
۴ ارب ۳۲ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے

اخراجات

صوبے	۲ ارب ۷ کروڑ روپے
زراعت	۵۹ کروڑ روپے
صنعت و معدنیات	۴۶ کروڑ روپے
صحت	۲۲ کروڑ روپے
بجلی	۹۶ کروڑ روپے
پانی	ایک ارب ۱۵ کروڑ روپے
مواصلات	۲۷ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے
سندھ طاس	۳۷ کروڑ روپے
مکانات و شہری سہولتیں	۴۹ کروڑ روپے

کل ترقیاتی اخراجات
۵ ارب ۵۷ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے

پیداوار میں کمی

حکومت کا دعویٰ ہے کہ صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن حقائق اس کی تردید کرتے ہیں۔ اگر پیداوار میں اضافہ ہوا ہے تو پھر مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کس طرح ہوگیا۔ کیونکہ قیمت کا تعین طلب اور رسد کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد طلب میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اگر واقعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے تو اشیاء کے نرخ پہلے سے بھی کم ہونے چاہئیں۔

گزشتہ مالی پیداوار میں کمی کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ ایک تو مشرقی پاکستان کی علیحدگی، دوسرا صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کا موجودہ حکومت پر اعتماد نہ ہونا۔

مشرقی بازو، مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کے لئے ایک منڈی کا کام دیتا تھا۔ مغربی پاکستان کا تقریباً ۴۰ فیصد سوتی کپڑا مشرقی پاکستان میں صرف ہوتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد صنعت کاروں کو فوراً دوسری منڈی نظر نہیں آئی، چنانچہ انہوں نے ملوں کو بند کر دیا۔ بعض ملوں کو جزوی طور پر بند کر دیا گیا۔ بعض میں تالہ بندی کر دی گئی۔

موجودہ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کو یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت اپنے منشور کے مطابق ملوں کو قومی تحویل میں لے لیگی چنانچہ انہوں نے نئے صنعتی منصوبوں پر عمل کرنے کا خیال ترک کر دیا اور پہلے سے قائم شدہ صنعتوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ تالہ بندی، چھانٹی اور مزدوروں کی برطرفی کا سلسلہ شروع کر دیا تاکہ حکومت پر دباؤ ڈالا جائے۔ اور وہ اپنے اس عوام دشمن منصوبے میں کامیاب بھی ہوگئے۔ لیکن اس کشمکش میں صنعتی پیداوار میں کمی پیدا ہوگئی۔

کرنسی کی قیمت میں کمی

پاکستانی سکے کی قیمت میں کمی کرنے سے مہنگائی کا عمل تیز تر ہوگیا۔ اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستانی روپے کی قیمت حقیقت پسندانہ نہیں تھی، اور دوسرے بونس اسکیم کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے چند اقدامات کی ضرورت تھی۔ مگر ۱۳۰ فیصد تک کی کمی کرنا بھی کوئی دانشمندانہ اقدام نہیں تھا۔ کرنسی کی قیمت میں کمی سے پہلے امریکہ سے درآمدات ایک ڈالر، ۴ روپے ۷۶ پیسے کی شرح سے کی جاتی تھیں۔ لیکن اب ایک ڈالر کے لئے ہمیں تقریباً دس روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں، اس کے نتیجہ میں درآمد شدہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ اور ملکی صنعت کاروں نے اپنی مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا۔ اس کے علاوہ بنک کی شرح سود ۱۰ فیصد کر دی گئی۔ صنعتکاروں نے اپنے منافع میں کمی کرنے کی بجائے یہ بوجھ بھی صارفین کے

بجٹ کے اہم نکات

- ۱۹۷۳-۷۴ء کے مالی سال میں آمدنی کا اندازہ ۹ ارب ۴۲ کروڑ کا لگایا گیا ہے جو موجودہ سال کی نظر ثانی شدہ تخمینہ سے ایک ارب روپے ہے۔
- دفاع پر ۴ ارب ۲۳ کروڑ روپے کے اخراجات ہوں گے۔
- سالانہ ترقیاتی پروگرام پر اخراجات کی حد ۵ ارب ۵۷ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے رکھی گئی ہے جو ۷۲-۷۳ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام پر ہونے والے اخراجات سے ۳۴ فیصد زیادہ ہے۔
- ۱۹۷۳-۷۴ء کے لئے غیر ترقیاتی اخراجات کا اندازہ ۸ ارب ۷۲ کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔
- ترقیاتی پروگرام میں زراعت کے لئے رقم موجودہ مالی سال کی رقم ۳۸ کروڑ سے بڑھا کر ۵۹ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔
- ایک ارب روپے کی کھاد درآمد کرنے کا انتظام کیا گیا ہے، جو کاشت کاروں کو رعایتی قیمت پر فراہم کی جائے گی۔
- ۶ ہزار ٹریکٹروں کی درآمد کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔
- آئندہ مالی سال کے لئے گندم کی پیداوار کی حد ۸۵ لاکھ ٹن مقرر کی گئی ہے۔ جبکہ موجودہ مالی سال کی حد ۷۴ لاکھ ٹن مقرر کی گئی تھی۔
- چاول کی پیداواری حد ۳۰ لاکھ ٹن مقرر کی گئی ہے جبکہ موجودہ سال میں چاول کی پیداواری حد ۲۲ لاکھ ٹن مقرر کی گئی تھی۔
- ۱۹۷۳-۷۴ء کے مالی سال کے لئے روئی کی پیداواری حد ۴۳ لاکھ گانٹھیں مقرر کی گئی ہیں۔ جبکہ اس سال ۴۰ لاکھ گانٹھوں کی حد مقرر کی گئی تھی۔
- آئندہ مالی سال میں مجموعی طور پر غذائی اجناس کی پیداوار میں ۲۰ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوگا۔
- موجودہ مالی سال میں ۳۸ کروڑ ۹۰ لاکھ ڈالر کی بیرونی امداد ملی۔
- صنعتی ایندھن اور معدنیات کے شعبہ کیلئے آئندہ مالی سال کے لئے ۴۶ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے جبکہ موجودہ مالی سال میں ۳۳ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تھی۔
- سالانہ ترقیاتی پروگرام میں مکانات کی تعمیر اور اس کے متعلقہ امور کیلئے ۴۹ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔
- سالانہ ترقیاتی پروگرام میں کم آمدنی والے افراد کیلئے مکانات کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔
- آئندہ مالی سال کے لئے پنجاب میں ۲۸۰ میل لمبے ہائی وے کو چوڑا کرنے اور مرمت کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے جبکہ سندھ میں ۱۵۰ میل سرحد میں ۱۱۰ میل اور بلوچستان میں ۱۲۲ میل لمبی سڑکوں کی تجویز ہے۔
- انڈس ہائی وے اور آر سی ڈی ہائی وے کی تعمیر کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔
- ۱۹۷۳-۷۴ء کے دوران پانچ سو دیہات میں بجلی پہنچائی جائے گی۔
- شہروں میں آمد و رفت کا نظام بہتر بنانے کیلئے آئندہ مالی سال میں ۴ ہزار نئی بسیں چلائی جائیں گی۔
- آئندہ مالی سال کے دوران ۲ ہزار ٹیوب ویل لگائے جائیں گے۔
- آئندہ مالی سال کے دوران ۲۷ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی لاگت سے ۲۵ ہزار نئے ٹیلیفون لگائے جائینگے۔

کندھوں پر منتقل کر دیا۔

غیر ترقیاتی اخراجات میں اضافہ

۱۹۷۳-۷۴ء کے بجٹ میں ترقیاتی اخراجات کے لئے ۵ ارب ۷۵ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔ اور غیر ترقیاتی اخراجات کا تخمینہ ۸ ارب ۵۰ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے لگایا گیا ہے۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں بجٹ کو مکمل طور پر ترقیاتی بجٹ نہیں کہا جا سکتا۔ ان غیر ترقیاتی منصوبوں پر اتنی کثیر رقم خرچ کرنے سے افراطِ زر میں مزید اضافہ ہوگا۔ اور اس طرح افراطِ زر کی روک تھام کی کوشش ناکام ہو جائے گی۔ عوام کو توقع تھی کہ مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے بعد غیر ترقیاتی اخراجات میں ۵۵ فیصد نہ سہی، ۴۰ فیصد ضرور کمی واقع ہوگی۔ لیکن نجانے کن وجوہات کی بنا پر اس سال گزشتہ سال کے مقابلے میں غیر ترقیاتی اخراجات میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔ ہمارے خیال میں وزیروں اور اعلیٰ احکام کی کاروں، بنگلوں اور تنخواہوں میں بے پناہ اضافے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس مد میں کم سے کم اخراجات کرنا وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

زراعت پر ٹیکس نہیں لگایا گیا

اس بجٹ میں بھی گزشتہ سالوں کے بجٹ کی طرح زرعی شعبہ پر ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ حالانکہ زرعی پیداوار میں اچھا خاصا اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان اقتصادی جائزے ۱۹۷۲-۷۳ء کے مطابق گندم کی پیداوار میں ۹ فیصد، گنے کی پیداوار میں ۷ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اور زرعی پیداوار میں مجموعی طور پر ۳ فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اقتصادی جائزے میں کہا گیا ہے کہ زرعی شعبہ کی آمدنی، ملک کی کل آمدنی کا ۳۸ فیصد حصہ ہے۔ لہٰذا ۳۸ فی صد حصہ پر کوئی ٹیکس نہ لگانا، ٹیکسوں کا تمام بوجھ صنعت و حرفت اور دوسرے شعبوں پر منتقل کر دینا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ یہ اشد ضروری تھا کہ بڑی بڑی زمین داریوں پر زرعی ٹیکس لگایا جاتا۔ اس مد سے یقیناً اتنی آمدنی ہو جاتی کہ سیلز ٹیکس میں اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مگر اسمبلی اور حکومت میں

کرنسی نوٹوں کے پھیلاؤ نے قیمتوں پر بے پناہ دباؤ ڈالا ہے

جاگیرداروں کی اجارہ داری کی وجہ سے وزیر خزانہ یہ اقدام نہیں اٹھا سکے۔ ہم ان کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں۔

اس بجٹ میں متوسط طبقہ کو آمدنی ٹیکس میں جو چھوٹ دی گئی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ اب سالانہ آمدنی جس پر ٹیکس لگے گا، ۷ ہزار روپے سے بڑھا کر ۹ ہزار روپے کر دی گئی ہے لہٰذا درمیانے طبقے کو اس اقدام سے تقویت ملے گی۔ اگرچہ ہوش رُبا گرانی کی وجہ سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔

بجٹ میں بجلی کی شرح میں اضافہ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سے قیمتوں میں مزید اضافہ ہوگا۔ کیونکہ صنعت کار اس اضافے کو اپنی مصنوعات کی لاگت میں شمار کر کے قیمتوں میں اضافہ کر دیں گے۔ اور اس کا بوجھ صارفین کے کندھوں پر پڑے گا۔

مرکزی وزیر خزانہ نے ٹیکسوں کی چوری کو روکنے کے لئے ٹیکس کے قوانین میں چند تجاویز کا ذکر کیا ہے، جو کہ وہ مالیاتی بل میں شامل کریں گے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس سلسلے میں قوانین کو سخت ترین کیا جائے اور جرمانہ میں اضافہ کیا جائے، اور چوری کو روکنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں۔



پردہ چاک

الفتح رپورٹ

وزارتِ تعلیم نے سنیارٹی لسٹ کی بجائے "بلیک لسٹ" شائع کردی

وزارت تعلیم - صوبائی وزیرِ تعلیم

اِن دنوں صوبائی وزیرِ تعلیم جناب در محمد اُوستو اندر اور باہر دونوں جگہوں میں بھرپور تنقید کا نشانہ بن گئے ہیں۔ اندر اور باہر سے ہماری مراد صوبائی اسمبلی اور پبلک پلیٹ فارم ہے۔ صوبائی اسمبلی کی کارروائی کے دوران ان کی کارکردگی اس قدر خراب رہی کہ سپیکر کو مجبوراً ریمارک دینا پڑا کہ "صوبائی وزیرِ تعلیم نے اپنے سابقہ ریکارڈ کا خیال نہیں رکھا۔"

پبلک پلیٹ فارم پر اساتذہ کی بوگس اور قابلِ مذمت سنیارٹی لسٹ شائع کرنے پر اساتذہ برادری کی کڑی نکتہ چینی کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ غرضیکہ اس وقت صوبائی وزیرِ تعلیم نے اپنی پگڑی میں بدنامی کے کئی پَر سجا لئے ہیں۔ اخبارات میں ان کے "کارناموں" کے چرچے ہیں۔

صوبائی وزیرِ تعلیم خود اپنے محکمے سے اتنے بے خبر ہیں کہ انہیں اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اساتذہ کی سنیارٹی لسٹ مرتب کرنے والے کس انداز سے فہرست کی تیاری میں مصروف ہیں۔ جناب در محمد اُوستو کی اس عدمِ دلچسپی کے سبب وزارتِ تعلیم کے ذمہ دار افسران نے اس لسٹ کی تدوین اور اشاعت کے دوران دھاندلی، اقربا نوازی اور غیر ذمہ داری کے جو نمونے پیش کئے ہیں، ان کی مثال نہیں ملتی۔ یہ لسٹ جیسے انتہائی محتاط اور خفیہ طریقہ سے وزارتِ تعلیم کے دفتر میں تیار کی جانی چاہیئے تھی۔ اس کے تمام کاغذات علامہ اقبال کالج کے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ ہوئے۔ اور ایس۔ ایم کالج میں انکو سائیکلو اسٹائل کیا گیا۔

اس پورے کام کی نگرانی مفاد پرست اور آلۂ کار افراد کا مٹھی بھر گروہ کرتا رہا۔ ان لوگوں کو سنیارٹی لسٹ میں ہر طرح سے نوازا گیا۔ اس کھلی دھاندلی پر اساتذہ برادری میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ ان کے دستاویزی ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں، اور اگر ضرورت محسوس کی گئی تو ہم وہ دستاویزات شائع کر کے محکمہ تعلیم کے اس "بدترین فراڈ" اور دھاندلی کا پردہ چاک کر دیں گے۔ اس میں سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس دھاندلی میں مغربی پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کے چند ایسے افراد بھی شامل ہیں جو نوکر شاہی کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، اور اساتذہ برادری کے عظیم تر مفادات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس مفاد پرست طبقہ میں ایسوسی ایشن، صوبہ سندھ کے جنرل سیکریٹری جناب مصطفٰے احسنین بھی شامل ہیں جو علامہ اقبال کالج میں پڑھاتے ہیں۔ ان کے ساتھ سنیارٹی لسٹ میں خصوصی اور امتیازی سلوک کیا گیا ہے۔ موصوف ڈائریکٹر نیشنلائزیشن جناب کاروانی کے ساتھ لسٹ کی تیاری میں قدم بہ قدم ساتھ رہے ہیں۔

علامہ اقبال کالج کے لیکچرار مصطفٰے احسنین کو اساتذہ برادری کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے صلے میں سنیارٹی لسٹ میں ایک علیحدہ نمبر ۱۲۰-اے الاٹ کیا گیا۔ جبکہ کسی دوسرے اساتذہ کے ساتھ اے-بی-سی کی بات نہیں کی گئی ہے۔ ایک سے لے کر ۶۳۶ کے بعد یہ نمبر علیحدہ سے نمودار ہوتا ہے۔ ان کے تدریسی تجربے کو ۱۹۶۲ء سے شامل کیا گیا ہے جبکہ موصوف ۱۹۶۶ء تک وزارتِ اطلاعات میں بحیثیت کلرک کام کرتے تھے۔ یہ بات آج بھی گورنمنٹ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ کالجوں کو قومیانے کے آخری مرحلے تک انکی حیثیت جزوقتی اُستاد کی تھی۔ خود سنیارٹی لسٹ میں حکومت نے ستمبر ۷۲ء میں ان کی جو تنخواہ ادا کی ہے وہ ۵۰۱-۴۰ روپے ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ کُل وقتی اُستاد کے طور پر ان کا تقرر بالکل نیا تھا۔

اسی طرح اردو کالج کے چہیتے پرنسپل خلیل اللہ کے ساتھ خصوصی سلوک کیا گیا۔ اس سے قبل اس پرنسپل کے سیاہ کارناموں کی جھلکیاں الفتح میں شائع ہو چکی ہیں کہ موصوف نے کس طرح محکمہ تعلیم اور صوبائی وزیرِ تعلیم کے گرد اپنی چرب زبانی کا جال پھیلا رکھا ہے۔ ان کی سنیارٹی ۵۴ء سے دکھائی گئی ہے

وزارت اطلاعات کے سابق کلرک کو سینئر استاد بنا دیا گیا

در محمد اوستو اسمبلی کے اندر اور باہر تنقید کا نشانہ بن گئے

جبکہ اردو کالج میں ان کا تقرر ۱۹۵۸ء میں ہوا تھا۔ انہوں نے چار سال اعزازی طور پر پڑھانے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس چار سال کی مدت کو بھی ان کے تدریسی تجربے میں شامل کر کے انکی سنیارٹی ۱۹۵۴ء سے کردی گئی ہے۔ یہ صریحاً دھاندلی اور اقربا پروری کی مثال ہے۔ کیا صوبائی وزیر جناب در محمد اوستو اس بات کا جواب دیں گے کہ یہ امتیازی سلوک کس بناء پر کیا گیا، اور اس کا جواز کس طرح پیدا کیا گیا۔؟

سنیارٹی لسٹ کے ۱۰ ویں نمبر پر گورنمنٹ سٹی کالج حیدر آباد کے ایک لیکچرار جناب واحد حسین نقوی کا نام ہے۔ موصوف نے ایم۔ اے ۱۹۵۷ء میں کیا ہے، لیکن سنیارٹی لسٹ میں ان کی سروس کی مدت ۱۹۵۱ء سے دکھائی گئی ہے۔

پوری سنیارٹی لسٹ کسی ضابطے اور مسلّمہ اصول کے بغیر مرتب کی گئی ہے۔ اساتذہ کی اکثریت کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ اس کے برعکس وزارتِ تعلیم اور صوبائی وزیر تعلیم کے آلۂ کار اساتذہ کو ہر طرح سے نوازا گیا۔ ان کے اعزازی تجربے، ڈپٹی ڈائریکٹر کے دوران کی مدت، سرکاری کالجوں کے تجربے، جزوقتی تدریسی تجربے کو شامل کیا گیا ہے۔ تاکہ انہیں سنیارٹی میں فائدہ پہنچے، جبکہ دوسری طرف اساتذہ کی اکثریت کے ساتھ یہ امتیازی برتاؤ نہیں کیا گیا۔ اس عمل میں وزارتِ تعلیم کے افسران نے پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وزارتِ تعلیم میں کام کرنے والے ذمہ دار افراد نے اپنی اور اپنے محکمہ کی بدنامی اور رسوائی کا بھی خیال نہ رکھا۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ وزارتِ تعلیم میں نوکر شاہی موثر اور مضبوط ہے۔ اور اب بھی وہ حکومت کے خلاف ایک فریق کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔

اس نام نہاد اور بوگس لسٹ میں جن اساتذہ کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے، ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ البتہ چند ایک واقعات کے حوالے سے اس دھاندلی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سراج الدولہ کالج کی پروفیسر ڈاکٹر صغرا کو سنیارٹی لسٹ میں ۲۴۴ نمبر پر رکھا گیا ہے۔ اگر سنیارٹی لسٹ کو ایمانداری سے مرتب کیا جائے تو ان کا نام شروع کی دس خواتین میں ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ صورتِ حال اس طرح پیدا کی گئی کہ ان کے سرکاری کالج کے تدریسی تجربے کو سنیارٹی میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس طرح ان کی سنیارٹی ان خواتین پروفیسروں سے بھی کم ہوگئی جو ان کی شاگرد رہ چکی ہیں۔

ستمبر ۷۲ء میں اساتذہ کی ملک گیر تحریک کے نتیجے میں اساتذہ کی نمائندہ تنظیم اور مرکزی وزیر تعلیم کے درمیان یہ بات طے پائی تھی کہ سنیارٹی لسٹ کی اشاعت سے قبل اساتذہ کا نہ تو ٹرانسفر کیا جائے گا اور نہ ہی ایسی کوئی تبدیلی کی جائے گی۔ جس سے اساتذہ کی سنیارٹی متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ لیکن پچھلے نو ماہ سے سنیارٹی کے تعین کے بغیر مختلف کالجوں میں سینئر اساتذہ کی جگہ جونیئر اساتذہ کو بحیثیت پرنسپل تقرر عمل میں لایا گیا۔ اور ۵۰ فیصد ایسے جونیئر اساتذہ مختلف کالجوں

اهم کاغذات علامه اقبال کالج کے ٹاپ رائٹر پر تیار کئے گئے!

کے پرنسپل بنے بیٹھے ہیں، جو اپنے تدریسی تجربے کی روشنی میں پرنسپل بننے کے مجاز نہیں ہیں۔ اس کے برعکس بے شمار ایسے اساتذہ کو جو ۲۵ - ۲۵ سال کا تدریسی تجربہ رکھتے ہیں، مختلف کالجوں میں بحیثیت لیکچرار کام کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ ان میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کہیں زیادہ زیادتی کا شکار ہیں۔

اساتذہ کی تنخواہ کا تعین، ان کی سالانہ ترقی کی ادائیگیاں پروفیسر اور اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدوں پر تقرری کا تعلق براہِ راست اساتذہ کی سنیارٹی کے تعین سے ہے۔ پچھلے نو ماہ سے جب سے تعلیمی ادارے سرکاری تحویل میں لئے گئے، ہر ماہ صوبائی وزیر تعلیم یا ذمہ دار حکام پریس کانفرنس اور بیانات کے ذریعہ اساتذہ کو یہ یقین دلاتے رہے کہ سنیارٹی لسٹ فوری طور پر شائع کر دی جائے گی۔ لیکن اس کی "پیدائش" میں نو ماہ کا عرصہ صرف ہوگیا۔ اور اب حال ہی میں جبر سنیارٹی لسٹ کا اعلان کیا گیا۔ اس میں بدنظمیوں، بے ضابطگیوں، دھاندلیوں اور خامیوں کا عالمی ریکارڈ قائم کیا گیا۔ یہ لسٹ اس قابل نہیں کہ اس پر عمل درآمد کیا جا سکے۔ اساتذہ برادری اور ان کے نمائندوں نے سنیارٹی لسٹ کی اشاعت کے ساتھ ہی پورے زور شور سے صوبائی وزیر تعلیم اور محکمہ تعلیم کے ذمہ دار حکام کی ـــ مذمت کی اور ان پر آلۂ کاروں کو نوازنے اور بدعنوانیوں کے سنگین الزامات عائد کئے۔

ادھر یہ صورتِ حال دیکھ کر صوبائی وزیر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صوبائی اسمبلی کے اجلاس کے دوران ان کی کارکردگی پر کڑی نکتہ چینی بھی کی گئی۔ باہر اساتذہ ان کے لتّے لے رہے تھے اور تو اور پی پی اینڈ غلام علی بھی بھاگم بھاگ پہنچے اور لسٹ کی خامیوں کی نشاندہی کر ڈالی۔ غیر تو غیر حبیب اپنوں نے بھی کپڑے نکالنے شروع کئے تو صوبائی وزیر کو خیال آیا کہ یقیناً غلطی ہوگئی ہے۔ ایسی ویسی بھی نہیں بھاری غلطی ہوئی۔ اگر کوئی دوسرا ملک ہوتا تو یقیناً وزیر تعلیم ایک اچھی اور قابل تقلید روایت پر عمل کرتے ہوئے مستعفی ہو جاتے۔ لیکن اتفاق سے ادھر ایسی کوئی روایت قائم نہیں ہے۔ وزارتِ تعلیم کی نوکر شاہی کے لئے یہ لسٹ الگ سے گلے کی ہڈی بن گئی۔ اگر ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا جاتا اور لسٹ کو "شراب نہیں شربت" ثابت کیا جاتا تو ممکن تھا کہ یہ معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر جاتا اور نوکر شاہی کی بدعنوانی کی سزا صوبائی وزیر تعلیم کو اپنے عہدے سے دستبرداری کی صورت میں بھگتنی پڑتی۔ اس دوران صوبائی وزیر تعلیم نے مغربی پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر جناب رشید پٹیل کو بلوا بھیجا۔ رشید پٹیل نے صاف صاف بتا دیا کہ "اس بوگس لسٹ کو اساتذہ ہرگز

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

یونیورسٹی پر پابندی کا نیا ڈرامہ

سمسٹر سسٹم

طلباء کی اکثریت پر یونیورسٹی کے دروازے بند ہو جائیں گے

الفتح رپورٹ :-

رسوائے زمانہ یونیورسٹی آرڈیننس ۱۹۶۱ء کی تنسیخ سے تعلیمی اداروں میں آزادئ افکار کی بحالی کے امکانات روشن ہو چلے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید جامعہ کراچی میں جمہوریت کا سورج کبھی نہ طلوع ہو سکے گا۔ یونیورسٹی کے ڈین آف آرٹس ڈاکٹر حفیظ زیدی نے کلیہ فنون کے اساتذہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ موجودہ امتحانی نظام کو ختم کر کے امریکی سمسٹر سسٹم یعنی داخلی امتحانات پر مبنی طریقہ رائج کیا جائے۔ اور نئے نظام کے نفاذ کے لئے سفارش پیش کرنے کے لئے اپنے حواریوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی ہے ظاہر ہے کہ ایسا اہم قدم اٹھانے سے پہلے اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور و خوض کرنا ضروری تھا۔ لیکن فاضل ڈین (جو خود سمسٹر سسٹم سے مطلقاً واقف نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے جن جامعات میں تعلیم حاصل کی ہے وہاں یہ طریقہ مروج نہ تھا) اس کی افادیت پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر حفیظ زیدی کا کہنا ہے کہ اس اصلاح کی غرض و غایت تعلیمی معیار کو بلند کرنا ہے لیکن وہ اس دعوے کے ثبوت میں کوئی ٹھوس دلائل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا آکسفورڈ کیمبرج لندن، انڈنبرا اور سوربون وغیرہ یونیورسٹیوں کا معیار کسی امریکی یونیورسٹی سے کمتر ہے؟ کیا ان یونیورسٹیوں میں سمسٹر سسٹم رائج ہے؟ دراصل کسی یونیورسٹی کے معیار کا انحصار محض اس طریقہ کے نفاذ پر نہیں۔ بلکہ معیاری کتب خانوں اور جدید آلات سے لیس لیبارٹریوں تحقیق و تدریس کی سہولتوں، علمی روایات و ماحول اور تربیت یافتہ اساتذہ اور محققین پر ہے۔ دراصل تعلیمی معیار کی آڑ میں ڈاکٹر حفیظ زیدی اور ان کے مٹھی بھر ہم خیال ساتھی طالبعلموں کو کچلنا چاہتے ہیں۔ ان کا شروع ہی سے یہ خیال رہا ہے کہ طلبہ کو گرفت میں لینے کے لئے یہ بڑا موثر نسخہ ہے۔ کیونکہ اس نظام کے تحت داخلی امتحانات ہوا کریں گے۔ جس میں طلبہ متعلقہ اساتذہ کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ ماضی میں یہ طریقہ جزوی

> **یونیورسٹی کے**
>
> **نئے تھانیدار حفیظ زیدی**
>
> **کی ایک خطرناک تجویز**

طور پر آزمایا گیا تھا لیکن مکمل طور پر ناکام ثابت ہوا۔ خود طلبہ نے اس کی شدید مخالفت کر کے اسے ختم کرا دیا۔ اس کے خلاف طلبہ کی سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ اکثر وہ جانبدارانہ رویہ اور ناانصافی کے شکار ہوا کرتے تھے اور انتقامی کاروائی کا نشانہ بنتے تھے۔ انہیں اپنی شخصیت، اپنی انفرادیت اور اپنے افکار کو دوسرے کی انا کے تابع کرنا پڑتا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نقصان اٹھاتے۔ بد قسمتی سے ہمارے معاشرہ کا اخلاقی معیار انتہائی پست ہے اور اگر کسی فردِ واحد کو کلی اختیارات سونپ دیئے جائیں تو وہ دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے۔ لہٰذا افراد کو زیادہ سے زیادہ تحفظ دینا چاہیئے تاکہ ان کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیمی اداروں میں بھی طلبہ کے ساتھ داخلوں اور امتحانات میں ناانصافیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کم از کم بیرونی ممتحن کے باعث طلبہ کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور دھاندلیوں کا سدِباب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ طلبہ سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوتا، لہٰذا اسے غیر جانبدار رہنا پڑتا ہے۔ اگر سمسٹر سسٹم نافذ کر دیا گیا تو آئے دن طلباء سیاسی، نظریاتی اور ذاتی اختلافات کا نشانہ بنیں گے۔ جس کے باعث بجائے بے چینی کم ہونے کے اور بڑھے گی اور تعلیم متاثر ہو گی۔ ڈاکٹر حفیظ زیدی صاحب سے دست بستہ عرض ہے کہ تعلیمی مسئلوں کا تھانیدارانہ حل نہ تلاش کریں۔ کیونکہ ہمارے طلبہ عادی مجرم نہیں کہ ان کے خلاف تعزیری اقدامات کئے جائیں۔ وہ اس ملک کے پُرامن اور آزاد شہری ہیں اور

طلبا سیاسی نظریاتی اور ذاتی اختلافات کا نشانہ بنیں گے

مستقبل کے معمار ہیں۔

علاوہ ازیں اس نئے نظام میں اساتذہ و طلباء کی تعداد میں توازن و تناسب از حد ضروری ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں تقریباً تین سو اساتذہ اور کئی ہزار طالب علم ہیں جن سے ہر استاد پر بہت بار پڑتا ہے۔ ہم ڈاکٹر زیدی سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ اپنے اساتذہ کو وہ تمام سہولتیں بہم پہنچا رہے ہیں، جو امریکی یونیورسٹیوں میں اساتذہ کو میسر ہیں۔ وہاں تو ہر استاد کو اس کا اپنا مخصوص مضمون ہی پڑھانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے وظائف و ریسرچ گرانٹ ملتی رہتی ہیں تاکہ وہ تحقیق و تصنیف کا کام جاری رکھے۔ اسکے برعکس کراچی یونیورسٹی میں اساتذہ کو مختلف مضامین پڑھانے پڑتے ہیں، جو اکثر بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بسا اوقات تو ایک استاد کو یہ بھی معلوم نہیں رہتا کہ اسے آئندہ سال کون سا مضمون پڑھانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں تعلیمی معیار کیسا ہوگا۔ کراچی یونیورسٹی میں تو بعض اساتذہ کے پاس علیحدہ کمرہ بھی نہیں۔ کہیں تو ایک ایک کمرے کے اندر چار یا پانچ اساتذہ بیک وقت بیٹھے ہوتے ہیں، اور بعض کے پاس تو اس گرمی میں پنکھا تک نہیں۔ ہاں ڈاکٹر حفیظ زیدی کا کمرہ البتہ بڑا کشادہ اور آراستہ و پیراستہ ہے۔ ڈین ہونے کے بعد ہی انہوں نے نئے قیمتی پردے، قالین اور فرنیچر وغیرہ، (جس کی لاگت ہزار ہا روپے ہے) سے اپنے کمرے کو حجلہ عروسی کی طرح سجایا ہے۔ ان کے دفتر کی سج دھج دیکھ کر یہ بات سمجھ میں آئی کہ آخر یونیورسٹی کیوں کر تیس لاکھ روپے کے خسارہ میں ہو سکتی ہے۔

سمسٹر طریقۂ تعلیم کے نتیجے میں کراچی یونیورسٹی کے ہزارہا نادار اور غریب طلبہ جو پرائیویٹ طالب علموں کی حیثیت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، تعلیم سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ اس طرح نوجوانوں کی کثیر تعداد پر تعلیم کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور انہیں جبریہ طور پر روزگار سے محروم کر دیا جائے گا اور انہیں بیروزگاری اور فاقہ کشی کا سامنا کرنا ہوگا۔ کیا ہم کراچی کے شہری کی حیثیت سے ڈاکٹر زیدی سے سوال کر سکتے ہیں کہ آخر آپ اپنے شہری بھائیوں کو کس جرم کی سزا دے رہے ہیں؟ ایک طرف تو حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ شہریوں کے لئے تعلیم عام کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف یونیورسٹی کی انتظامیہ خود مختاری کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے محنت کش عوام کو تعلیم حاصل کرنے سے روکتی ہے۔ لیکن ملک کے شہری اس عوام دشمن پالیسی کو ناکام بنا دیں گے۔

ہماری اطلاع کے مطابق کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ کی ہمہ گیر اکثریت اس منصوبہ کے خلاف ہے۔ یہ کام ڈین کلیہ فنون ڈاکٹر حفیظ زیدی اور مختصر ٹولے کا ہے جو یونیورسٹی کی انتظامیہ پر حاوی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ زیدی نے یونیورسٹی میں اپنے مختصر زمانۂ ملازمت میں کئی رنگ بدلے۔ موصوف سابق رجسٹرار نجم الدین (جو گزشتہ سال جبریہ طور پر ریٹائر کر دیئے گئے تھے) کے مصاحبین میں سے تھے اور انہی کے ذریعہ سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ جب ۶۹ء کے آغاز میں طلبہ نے ڈاکٹر قریشی کی برطرفی کا مطالبہ کیا تو ڈاکٹر حفیظ زیدی نے ان کے حق میں ایک دستخطی مہم چلائی۔ ایک مشترکہ بیان میں ڈاکٹر زیدی نے طلبہ کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کو ڈاکٹر قریشی پر مکمل اعتماد ہے۔ اور ان کی دلی خواہش ہے کہ وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہیں۔ یہ بیان مقامی اخبارات میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر حفیظ زیدی نے سابق وائس چانسلر سے بڑی مراعات حاصل کیں۔ وہ کئی سینئر اساتذہ سے پہلے ہی پروفیسر بنا دیئے گئے۔ اور متعدد بار باہر "کانفرنس" میں شرکت کی خاطر گئے۔ جبکہ دوسرے اساتذہ کو یہ مواقع نہیں دیئے گئے۔ ایک بار وہ رخصت لے کر کچھ مدت کے لئے کسی بیرونی یونیورسٹی میں بھی گئے جہاں انہوں نے تنخواہ پر کام کیا۔ قاعدے کے مطابق اگر یونیورسٹی کا کوئی استاد بعوض تنخواہ کسی دوسرے ادارہ میں کام کرے تو وہ یونیورسٹی میں اپنے زمانۂ رخصت کی تنخواہ کا اہل نہیں ہوتا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر حفیظ زیدی نے واپس آتے ہی اس پوری مدت کی تنخواہ یونیورسٹی سے حاصل کر لی، اور اس طرح تقریباً ۱۸ ہزار روپیہ خلافِ قاعدہ حاصل کر لئے۔ ظاہر ہے کہ سابق رجسٹرار اور ڈاکٹر قریشی سے تعلقات کا انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دورِ آمریت میں وفادار دل کو ایسے انعامات و کرامات دیئے جاتے تھے۔ جب ڈاکٹر قریشی یونیورسٹی سے علیحدہ ہوئے تو ڈاکٹر حفیظ زیدی نے انہیں اپنے گھر میں ایک الوداعی دعوت دی جبکہ کراچی یونیورسٹی ٹیچرز سوسائٹی نے ان کے خلاف عدمِ اعتماد کی قرارداد پاس کی تھی اور ان کو الوداعیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ گو یونیورسٹی میں اب ڈاکٹر قریشی نہ رہے لیکن انکے بہی خواہ مختلف روپ میں اب بھی موجود ہیں۔

گو انہوں نے بدلے ہوئے حالات کے تحت چولا بدل لیا ہے لیکن ان کی گفتار اور کردار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آج بھی اپنی وضع پر قائم ہیں۔ سمسٹر سسٹم کے پس پردہ طلباء، اساتذہ پر اپنی گرفت مضبوط کر کے اپنے آمرانہ عزائم کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ایسے عناصر کی موجودگی، بے چینی اور خلفشار کا باعث بن سکتی ہے جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑے گا۔

ابھی حال ہی میں ٹیچرز سوسائٹی کے انتخابات میں ڈاکٹر حفیظ زیدی نے بیجا مداخلت کی جس سے اساتذہ میں انکے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بحیثیت ڈین کے انہیں غیر جانبدار رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن انہوں نے بعض اساتذہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنا ووٹ ان کے امیدوار کو دیں۔ اس بیجا مداخلت کا ردِ عمل اتنا شدید ہوا کہ ڈاکٹر زیدی کے محبوب امیدوار کو شکستِ فاش ہوئی۔ اسے اساتذہ نے ڈین کے خلاف عدمِ اعتماد کا ووٹ قرار دیا۔

اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ ڈاکٹر حفیظ زیدی کا نزلہ کراچی یونیورسٹی کے غیر تدریسی ملازمین کی یونین پر بھی گرا۔ وہ

(باقی صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

۷ جون کو سندھ کے وزیرِ محنت عبدالستار گبول نے صوبائی اسمبلی کو بتایا کہ گزشتہ صنعتی ہنگاموں کے دوران لانڈھی کے صنعتی علاقے کے ٹیکسٹائل ملوں سے دو سو مزدوروں کو برطرف کیا گیا تھا۔ صوبائی وزیرِ محنت کا یہ بیان حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ لانڈھی کے صرف گل احمد ٹیکسٹائل ملز سے ۶۸۲ مزدوروں کو برطرف کیا گیا۔ وزیرِ محنت کا فرض تھا کہ ارکانِ اسمبلی کو پورے سندھ کے صنعتی اداروں سے برطرف ہونے والے مزدوروں کی تعداد سے آگاہ کرتے لیکن نجانے کن وجوہات کی بنا پر انہوں نے بتانے سے گریز کیا۔ ہم ذیل میں ۱۶۰ اداروں سے برطرف ہونے والے مزدوروں کی تعداد درج کر رہے ہیں۔ تاکہ حقیقی صورتِ حال سے قارئین آگاہ ہو سکیں۔

آپ اپنی ہی اداؤں پہ ذرا غور کریں!...

صوبہ سندھ کے ۱۶۰ اداروں سے برطرف ہونے والے مزدوروں کی تعداد

—————: الفتح رپورٹ :-

نمبر شمار	صنعتی ادارے کا نام	مزدوروں کی تعداد	برطرفی اور چھانٹی کی تاریخ
۱	انٹرنیشنل لیبارٹریز لمیٹڈ	۵	مئی ۱۹۷۳ء
۲	فریسکو انڈسٹریز	۱۵۰	۲۲ر اگست ۱۹۷۲ء
۳	کراچی ٹیکسٹائل	۴۲	۱۵ر اگست ۱۹۷۲ء
۴	فیلکون انٹرنیشنل	۳۵	۲۷ر جولائی ۱۹۷۲ء
۵	اولمپیا ہوزری	۵۰	۸ر مئی ۱۹۷۲ء
۶	منور ملز	۳۸	یکم جون ۱۹۷۲ء
۷	غنی اینڈ کمپنی	۳۰	ایضاً
۸	ٹیری ٹاول	۲۰	ایضاً
۹	فائن ٹاول	۲۵	ایضاً
۱۰	ایمسکو	۴۸	دسمبر ۱۹۷۱ء
۱۱	مے فیئر ہوزری	۲۲	۳۱ر دسمبر ۱۹۷۱ء
۱۲	ویدلی سلک ملز	۱۵	۲۴ر جولائی ۱۹۷۲ء
۱۳	عابد انڈسٹریز	۳۹۷	۲ر جون ۱۹۷۲ء
۱۴	کراؤن سلک ملز	۱۵۰	یکم جنوری ۱۹۷۲ء
۱۵	ساجد سلک ملز	۳۱	ایضاً
۱۶	اورینٹل سلک ملز	۱۰۰	اگست ۱۹۷۱ء
۱۷	العظمت سلک ملز	۱۹	۱۵ر مارچ ۱۹۷۳ء
۱۸	دادا پلاسٹک	۲۰	۳۱ر جولائی ۱۹۷۲ء
۱۹	ریپبلک انڈسٹریل کارپوریشن	۲۵	۷ر اکتوبر ۱۹۷۲ء
۲۰	پاک گلاس انڈسٹریز	۳۵	۸ر جولائی ۱۹۷۲ء
۲۱	کھوکھر گلاس	۴۰	نومبر ۱۹۷۲ء
۲۲	اورنیٹ کارپٹ	۴۰	۵ر ستمبر ۱۹۷۲ء
۲۳	میٹلرک کارپوریشن	۶۵	فروری ۱۹۷۲ء
۲۴	کراچی انڈسٹریل کارپوریشن	۶۵	۳۱ر مئی ۱۹۷۲ء
۲۵	میبجر انڈسٹریز	۴۰	۲۰ر جولائی ۱۹۷۲ء
۲۶	لمٹن لمیٹڈ	۴۰	۲۷ر مئی ۱۹۷۲ء
۲۷	پاک پن انڈسٹریز	۴۶	۲۰ر جون ۱۹۷۲ء
۲۸	کوہ نور پلاسٹک ورکس	۳۵	۲۷ر جنوری ۱۹۷۳ء
۲۹	عبداللہ انڈسٹریز	۲۱	۳۱ر دسمبر ۱۹۷۱ء
۳۰	شہاب الدین ٹیکسٹائل ملز	۱۰	یکم دسمبر ۱۹۷۱ء
۳۱	شاہد ٹیکسٹائل ملز	۳۷۲	اپریل ۱۹۷۱ء
۳۲	رحیم لیس اینڈ جنرل ملز	۱۸	ایضاً

نمبر شمار	صنعتی ادارے کا نام	مزدوروں کی تعداد	برطرفی اور چھانٹی کی تاریخ
۳۳	ہارون لیس اینڈ جنرل ملز	۲۰	اپریل ۱۹۷۳ء
۳۴	تاج الدین سلک	۱۲۰	یکم ستمبر ۱۹۷۲ء
۳۵	جاپان ٹیکسٹائل	۲۲	۵ر ستمبر ۱۹۷۲ء
۳۶	الائیڈ ریان ملز	۲۵	یکم ستمبر ۱۹۷۲ء
۳۷	پاکستان اسٹیل انجینئرنگ ورکس	۱۶	۱۷ر دسمبر ۱۹۷۱ء
۳۸	گرین سلک ملز	۱۸	یکم جنوری ۱۹۷۲ء
۳۹	لکی سلک ملز	۵۰	۱۲ر اگست ۱۹۷۲ء
۴۰	طالب انڈسٹریز	۱۲	۲۱ر اگست ۱۹۷۲ء
۴۱	یونیورسل ڈائنگ اینڈ پرنٹنگ	۲۷	۲۴ر مئی ۱۹۷۱ء
۴۲	اسٹینڈرڈ جنرل اینڈ کاٹن انڈسٹریز	۹۰	۲۰ر ستمبر ۱۹۷۲ء
۴۳	ڈیکورا انٹرنیشنل	۱۰۰	۶ر مئی ۱۹۷۲ء
۴۴	اسٹار انڈسٹریز (سلک)	۶۴	۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء
۴۵	جی-ایم-آر سلک	۵۰	۴ر اپریل ۱۹۷۲ء
۴۶	رحمان انڈسٹریز	۲۵	۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء
۴۷	عظیم انڈسٹریز	۶۰	یکم اگست ۱۹۷۲ء
۴۸	شاہد سلک	۱۴	۱۵ر اگست ۱۹۷۲ء
۴۹	ایگل انڈسٹریز	۸۰	۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء
۵۰	عالم انڈسٹریز	۳۰	یکم جون ۱۹۷۲ء
۵۱	اروما انڈسٹریز	۲۵	یکم جون ۱۹۷۲ء
۵۲	الفاروق انڈسٹریز	۵۰	ایضاً
۵۳	کانٹینینٹل انڈسٹریز	۲۵	ایضاً
۵۴	پیرل انڈسٹریز	۲۰	ایضاً
۵۵	فرحت انڈسٹریز	۸۰	یکم جون ۱۹۷۲ء
۵۶	زیبا ٹیکسٹائل ملز	۶۰	دسمبر ۱۹۷۱ء
۵۷	تاج مبین	۷۰	یکم اکتوبر ۱۹۷۱ء
۵۸	پاکستان انڈسٹریل کارپوریشن	۱۵۰	۴ر ستمبر ۱۹۷۲ء
۵۹	جان لیس اینڈ جنرل ملز	۱۰۸	۱۸ر ستمبر ۱۹۷۲ء
۶۰	جعفر ابراہیم انڈسٹریز کارپوریشن	۲۱۳	ایضاً
۶۱	میک انڈسٹریز	۵۰	یکم اگست ۱۹۷۲ء
۶۲	مفضل فائن فیبرکس	۵۰	اپریل ۱۹۷۱ء
۶۳	وائی-ایم-ایچ-انڈسٹریز	۵۰	دسمبر ۱۹۷۱ء
۶۴	وینس انڈسٹریز	۵۰	جولائی ۱۹۷۲ء
۶۵	پیراماؤنٹ انڈسٹریز	۱۲۵	جولائی ۱۹۷۲ء
۶۶	ڈان فٹ ویئر	۱۸۰	ایضاً
۶۷	بنارس ساڑی ہاؤس	۳۵	اگست ۱۹۷۲ء
۶۸	ایس-این-ایچ انڈسٹریز	۶۶	۳۰ر جون ۱۹۷۲ء
۶۹	فرینڈز اسٹیشنرز	۱۰۰	۱۵ر ستمبر ۱۹۷۲ء
۷۰	کے-بی انڈسٹریز	۷۰	جون ۱۹۷۲ء
۷۱	یعقوب رولنگ ملز	۵۰	۲۳ر ستمبر ۱۹۷۲ء
۷۲	ڈان ہوزری	۱۵۰	اگست ۱۹۷۲ء
۷۳	ایگل ٹیکسٹائل ملز	۱۵۰	ایضاً
۷۴	امیر اینڈ نیشنل سلک ملز	۷۰	مئی ۱۹۷۲ء
۷۵	امیر آئرن اینڈ ووڈ ورکس	۱۷	جولائی ۱۹۷۲ء
۷۶	حافظ ٹیکسٹائل ملز	۳۰۰	۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۱ء
۷۷	پرنٹرز کمپائن	۸۰	۴ر اگست ۱۹۷۲ء
۷۸	منو موٹرز	۸۴	۱۶ر ستمبر ۱۹۷۲ء
۷۹	الائیڈ ٹریڈنگ کارپوریشن	۸۶	۲۰ر جنوری ۱۹۷۳ء
۸۰	اٹلس آٹوز	۳۰۰	۱۷ر اپریل ۱۹۷۳ء
۸۱	بلامکس کینسٹنٹس	۲۲	دسمبر ۱۹۷۲ء
۸۲	گرویٹ پاکستان انجینئرنگ ورکس	۱۲	مارچ ۱۹۷۳ء
۸۳	انڈس میرین انجینئرنگ کمپنی	۲۶	جنوری ۱۹۷۳ء
۸۴	مانڈوی والا موٹرز	۱۲۰	ستمبر ۱۹۷۲ء
۸۵	احمد سلک	۳۵	نومبر ۱۹۷۲ء
۸۶	زیب تن ٹیکسٹائل ملز	۸۲	۱۶ر ستمبر ۱۹۷۲ء
۸۷	الحبیب ٹیکسٹائل بلیچنگ ملز	۶۰	ایضاً
۸۸	سلور برڈ پولٹری	۲۲	یکم اپریل ۱۹۷۳ء
۸۹	گیمسٹیز پاکستان لمیٹڈ	۲۱	یکم فروری ۱۹۷۳ء
۹۰	ساؤتھ برٹش انشورنس کمپنی	۵۰	یکم اپریل ۱۹۷۳ء
۹۱	سٹورڈنگ کمپنیز آف کراچی پورٹ ایریا	۱۰۰۰	جولائی ۷۲ تا مارچ ۱۹۷۳ء
۹۲	بیچ لگژری ہوٹل	۸۹	مئی اور جون ۱۹۷۲ء
۹۳	نیشنل ایورنیٹ کاٹن ملز	۶	اکتوبر ۱۹۷۲ء
۹۴	محبوب سلک ملز	۲۵	ستمبر ۱۹۷۲ء
۹۵	مختار سلک ملز	۱۱	اپریل، مئی ۱۹۷۳ء
۹۶	ولیسٹرن سلک ملز	۱۲	جنوری تا مارچ ۱۹۷۳ء

نمبر شمار	صنعتی ادارے کا نام	مزدوروں کی تعداد	برطرفی اور چھانٹی کی تاریخ
۹۷	بخارا انڈسٹریز	۳۰	نومبر دسمبر ۱۹۷۲ء
۹۸	العابد سلک ملز	۱۲	ستمبر تا دسمبر ۱۹۷۲ء
۹۹	چوہدری محمد دین انڈسٹریز	۳۵	ستمبر ۱۹۷۲ء
۱۰۰	اسپنرز بینک بار	۲۵	ستمبر تا دسمبر ۱۹۷۲ء
۱۰۱	المنسیر انڈسٹریز	۲۷	اپریل، مئی ۱۹۷۳ء
۱۰۲	اسٹار ٹیکسٹائل ملز	۳۱۱	۱۴ اپریل ۱۹۷۳ء
۱۰۳	سن پبلیکیشنز	۳	ستمبر ۱۹۷۲ء
۱۰۴	پی۔کے۔این کورنگی	۹۸	مئی ۱۹۷۳ء
۱۰۵	اٹلی ٹیکسٹائل ملز	۵۰	اپریل ۱۹۷۳ء
۱۰۶	باٹلے بیچ انڈسٹریز	۱۳	دسمبر ۱۹۷۲ء
۱۰۷	ڈالر انڈسٹریز	۴۶	نومبر ۱۹۷۲ء
۱۰۸	نیشنل انڈسٹریز (عمر رواں)	۳۴	جون ۱۹۷۲ء
۱۰۹	انٹرنیشنل پیکرز (وہارت)	۳۰	مارچ ۱۹۷۳ء
۱۱۰	پریمیئر مشینری ورکس (عثمان آباد)	۵	اپریل مئی ۱۹۷۳ء
۱۱۱	گل احمد ٹیکسٹائل ملز	۶۸۲	اکتوبر ۷۲ء کے بعد
۱۱۲	حسین ٹیکسٹائل ملز	۳۹۰	ایضاً
۱۱۳	آدم جی ٹیکسٹائل ملز	۷۷	ایضاً
۱۱۴	داؤد کاٹن ملز	۴۴	ایضاً
۱۱۵	فردوس ٹیکسٹائل ملز	۳۰	ایضاً
۱۱۶	اولمپیا ٹیکسٹائل ملز	۱۲	ایضاً
۱۱۷	العطاء ٹیکسٹائل ملز	۱۰	ایضاً
۱۱۸	گلوب ٹیکسٹائل ملز	۷۲	ایضاً
۱۱۹	نیشنل اسٹیل ملز	۲۸	ایضاً
۱۲۰	گلبرگ ٹیکسٹائل ملز	۱۲	ایضاً
۱۲۱	مشین ٹول فیکٹری	۵۵	ایضاً
۱۲۲	الیکن ٹوبیکو	۱۰۰	ایضاً
۱۲۳	نگینہ ٹیکسٹائل ملز	۵۰	ایضاً
۱۲۴	عوامی ٹیکسٹائل ملز	۳۰۰	ایضاً
۱۲۵	پرٹیکٹر ٹیرز	۱۲	ایضاً
۱۲۶	کوئٹہ ٹیکسٹائل ملز	۱۰۰	ایضاً
۱۲۷	کرنہ کاٹن ملز	۲۰۰	ایضاً
۱۲۸	ڈائینسٹائل ملز	۱۰۰	ایضاً

نمبر شمار	صنعتی ادارے کا نام	مزدوروں کی تعداد	برطرفی اور چھانٹی کی تاریخ
۱۲۹	بولان ٹیکسٹائل ملز	۱۰۰	اکتوبر ۷۲ء کے بعد
۱۳۰	فتح ٹیکسٹائل ملز	۲۰۰	ایضاً
۱۳۱	جوپیٹر ٹیکسٹائل ملز	۵۰	ایضاً
۱۳۲	محمدی ٹیکسٹائل ملز	۳۰	ایضاً
۱۳۳	سیمو ٹائیز	۸۰	ایضاً
۱۳۴	مہر ٹیکسٹائل ملز	۲۰	ایضاً
۱۳۵	کاف کاف ٹیکسٹائل ملز	۲۵۰	ایضاً
۱۳۶	شیزان انٹرنیشنل	۲۳	ایضاً
۱۳۷	شاہنواز لمیٹڈ	۶۳	ایضاً
۱۳۸	برائٹ الیکٹریکل کمپنی	۶۴	ایضاً
۱۳۹	بھامانی ایسوسی ایٹ	۶	ایضاً
۱۴۰	آٹوموبائل کارپوریشن آف پاکستان	۲۳	ایضاً
۱۴۱	رزاق انڈسٹریز	۱۵	ایضاً
۱۴۲	پاک زری کمپنی	۱۷	ایضاً
۱۴۳	عبداللہ انڈسٹریز	۳۴	ایضاً
۱۴۴	افضال اسٹور	۱۲	ایضاً
۱۴۵	نوینہ انڈسٹریز	۲۳	ایضاً
۱۴۶	لیاقت نیشنل ہسپتال	۴	ایضاً
۱۴۷	آدم ٹی	۱	ایضاً
۱۴۸	کھوکھر ملز	۴	ایضاً
۱۴۹	کمپنی وفیکٹری	۸	ایضاً
۱۵۰	اظہر سروسز پریس	۳۵	ایضاً
۱۵۱	ٹریڈ لینڈ انڈسٹریز	۲۲	ایضاً
۱۵۲	جواد گارمنٹس	۱۰۲	ایضاً
۱۵۳	زینت شرٹ فیکٹری	۲	ایضاً
۱۵۴	شاکر رحیم انڈسٹریز	۲۰	ایضاً
۱۵۵	سیلبا گائیکی	۱۸۰	ایضاً
۱۵۶	پوائنر ٹریڈنگ کمپنی	۲۰۰	ایضاً
۱۵۷	پاکستان گلاس انڈسٹریز	۵۰۰	مئی ۱۹۷۳ء
۱۵۸	بروک بونڈ	۳۰۰	۱۹۷۳ء
۱۵۹	ایکسائیڈ بیٹری	۷	۱۹۷۳ء
۱۶۰	مختلف چھوٹی فیکٹریاں	۲,۵۰۰	۷۲ تا ۱۹۷۳ء

لیاقت علی خان کے قتل میں سی آ

پاکستان میں سیاسی سازشیں -۳

-: جمنا داس اختر :-



محمد علی بوگرہ



غلام محمد

خواجہ ناظم الدین



نواب زادہ لیاقت علی خان کی شہادت کی تحقیقات کے لئے مرکزی حکومت نے ایک کمیشن قائم کیا۔ جسٹس منیر اس کے چیئرمین تھے۔ کمیشن نے راولپنڈی میں تحقیقات کا آغاز کیا۔ سی آئی ڈی نے کمیشن کی کارروائی میں مداخلت کرنے کی کوشش کی۔ سی آئی ڈی حکام نے گواہوں کو مرعوب اور خوفزدہ کرنے کے لئے اپنا اثرورسوخ اور طاقت استعمال کی۔ گواہوں کی کڑی نگرانی کی گئی۔ جب کمیشن کے علم میں یہ بات لائی گئی تو اس نے سی آئی ڈی کے اس مذموم کردار پر کڑی نکتہ چینی کی، اور کمیشن کے چیئرمین نے دھمکی دی کہ اگر سی آئی ڈی کے حکام نے اپنا رویہ نہ بدلا تو کمیشن کو لاہور منتقل کر دیا جائیگا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جے۔ ڈی۔ بارڈی بطور گواہ کمیشن کے سامنے پیش ہوئے اور انہوں نے کمیشن کو بتایا کہ "وزیراعظم کی شہادت کسی گہری سازش کا نتیجہ تھی۔ یہ انفرادی فعل نہیں تھا۔ میں اپنے تاثرات سے حکومت کو آگاہ کر چکا ہوں۔ مجھے خدشہ ہے کہ آئندہ بھی ایسے واقعات وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔ اس لئے حکومت کو چاہیئے کہ وہ حفاظتی اقدام سخت کر دے۔"

خان عبدالعزیز خان ایڈووکیٹ جنرل پنجاب کے ایک سوال کے جواب میں مسٹر بارڈی نے کہا کہ "میں وزیراعظم کی آمد پر کئے گئے حفاظتی انتظامات سے منسلک نہیں تھا۔ البتہ اس دن دس بجے میں نے کمپنی باغ کا معائنہ کیا تھا۔ اس معائنہ کا مقصد ان افراد سے واقف ہونا تھا جن کا تعارف وزیراعظم



ئی ڈی کا ہاتھ تھا؟

سے کرایا جاتا تھا۔"

مسٹر ہارڈی نے بتایا کہ جلسہ کا آغاز تلاوتِ قرآن سے ہوا۔ اس کے بعد شیخ محمد صدیق نے سپاسنامہ پیش کیا۔ پھر شیخ محمد عمر نے مختصر سی تعارفی تقریر کی۔ اس کے بعد لیاقت علی خان تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ابھی "برادرانِ ملت" کے الفاظ ہی ادا کئے تھے کہ پستول کے دو فائر ہوئے، اور وزیرِ اعظم ڈائس پر گر پڑے۔ مسٹر ہارڈی نے اپنے بیان میں کہا کہ "میں فوراً ڈائس پر گیا، دیکھا کہ نواب صدیق علی خان، وزیرِ اعظم کو سہارا دے رہے ہیں اور انہیں اپنے بازوؤں میں لئے ہوئے ہیں۔ زخمی وزیرِ اعظم کے لبوں پر "کلمہ" تھا۔ مجھے ڈائس پر آئے ہوئے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ تیسرے فائر کی آواز آئی، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ گولی کس سمت سے چلائی گئی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جس سمت سے پہلے دو فائر ہوئے تھے، اسی سمت سے تیسرا فائر بھی ہوا تھا۔ لیکن یہ بات میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میں وزیرِ اعظم پر جھک گیا اور ان سے پوچھا کہ کیا آپ کو گولی لگی ہے؟ وزیرِ اعظم نے انگریزی میں جواب دیا۔ اور بتایا کہ بائیں جانب درد ہو رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ پانی پینا پسند کریں گے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا "پلیز"۔ میں نے بلند آواز میں پانی لانے کے لئے کہا۔ میں ایمبولنس اور ڈاکٹر بلوانے کے لئے چیخ رہا تھا۔ لیکن کسی نے بھی میری اس چیخ و پکار پر دھیان نہیں دیا۔ اس کے چند سیکنڈوں کے بعد گولیوں کی بوچھاڑ کی آوازیں آئیں۔ چند گولیاں میرے سر پر سے گزریں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ گولیاں کس سمت سے چلائی گئی تھیں۔ ۱۲ سیکنڈ کے بعد گولیوں کی بوچھاڑ دوسری مرتبہ شروع ہو گئی۔ اس عرصے میں میں وزیرِ اعظم پر جھکا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ کلمہ پڑھ رہے تھے۔ کچھ وقفہ کے بعد فائرنگ رک گئی۔ فائرنگ کے بند ہوتے ہی چند افراد ڈائس پر آ گئے۔ ان میں سول ہسپتال کے ڈاکٹر انصاری بھی تھے۔ میں نے زخمی وزیرِ اعظم کی اچکن کے بٹن کھولے تو دیکھا کہ ان کے دل کے قریب سے خون بہہ رہا ہے۔ اسی عالم میں وزیرِ اعظم بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد وزیرِ اعظم کو ہسپتال لے جایا گیا، جہاں کرنل میاں اور کرنل سرور نے ان کا علاج کیا۔"

مسٹر ہارڈی نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ "میں یہ نہیں بتا سکتا کہ گولیوں کی بوچھاڑیں کن کن سمتوں سے آئی تھیں۔ گولیوں کی آوازیں سنتے ہی میرے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ منظم گروہ سرکاری حکام پر فائرنگ کر رہا ہے۔"

کمیشن کی راولپنڈی میں سات نشستیں ہوئیں جن میں چار گواہ پیش کئے گئے۔ ان گواہوں میں گرانڈ مسلم پاکستان ہوٹل راولپنڈی، جہاں سعد اکبر نے قیام کیا تھا، کا کلرک گل بہار شاہ، لال دین نامی ۲۰ سالہ قصائی، جس نے فائر ہوتے

تمہیں قتل کر دیا جائے گا!

لیاقت علی کے نام گمنام خطوط

ہی قاتل کو پکڑا تھا۔ اور راولپنڈی کے میونسپل کمشنر چوہدری مولاداد شامل تھے۔

گل بہار شاہ نے انکشاف کیا کہ سی آئی ڈی قاتل کی کڑی نگرانی کر رہی تھی۔ قاتل ۱۶ اکتوبر کو دو بجے ہوٹل سے باہر نکلا۔ اس وقت ایک سی آئی ڈی والے نے اس کا تعاقب کیا۔ گل شاہ نے بتایا کہ قاتل نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنے ہاتھ سے اپنے کوائف درج کئے تھے اور ان کوائف میں بتایا گیا تھا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔

دوسرے گواہ لال دین نے کمیشن کو بتایا "جیسے ہی وزیرِ اعظم نے "برادرانِ ملت" کے الفاظ ادا کئے، میری دائیں جانب سے دو گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ میں نے دائیں طرف گردن موڑی تو دیکھا کہ ایک پختون پستول ہاتھ میں لئے فرار ہونے کے لئے راہ تلاش کر رہا ہے۔ میں نے فوراً لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اس نے مجھے مارنے کے لئے تیسرا فائر کیا لیکن نشانہ خطا گیا۔ اسی عرصہ میں اللہ داد، مولاداد اور پولیس کا ایک حوالدار وہاں پہنچ گئے اور اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ سات اور آدمی بھی اس کام میں شریک ہو گئے۔ اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور آتے ہی اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔" لال دین نے کہا کہ "ہم نے قاتل کو پکڑ کر بے بس کر دیا تھا، لیکن پولیس افسر نے اسے ہلاک کر دیا۔"

راولپنڈی کے کمشنر انعام الرحمٰن نے اپنے بیان میں بتایا کہ "میں ڈائس پر موجود تھا۔ وزیرِ اعظم نے جیسے ہی "برادرانِ ملت" کے الفاظ ادا کئے، دو گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ اور وزیرِ اعظم گر پڑے۔ جلسہ میں انتشار اور خلفشار پھیل گیا۔ لوگ پناہ لینے کے

"ہم نے قاتل کو پکڑ لیا لیکن ایک پولیس افسر نے اسے گولی مار دی"

لئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اس وقت کسی نے ایمبولنس اور ڈاکٹر بلوانے کے لئے کہا۔ چند ساعتوں کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہارڈی بھی ڈائس پر پہنچ گئے۔ اور انہوں نے ڈاکٹر بلوانے کے لئے کہا۔ جب ڈرائیور کا انتظام ہو گیا تو وہ کرنل سرور کے گھر گئے۔ لیکن وہ نہ مل سکے۔ اس پر کرنل سرور کی بیوی کو، کرنل سے رابطہ قائم کرنے اور انہیں ہسپتال بھیجنے کی ہدایات دی گئیں"

انعام الرحمٰن نے مزید بتایا کہ جو شخص سب سے پہلے وزیرِ اعظم کو سہارا دینے کے لئے لپکا وہ نواب صدیق علی خان تھے، اور دوسرا مسٹر ہارڈی تھے۔

سعید علی اکبر شاہ، جس کی ڈیوٹی اس گیٹ پر تھی جس سے سعد اکبر جلسہ گاہ میں داخل ہوا تھا، نے بتایا کہ سعد اکبر اپنے ۱۹ سالہ بیٹے اور دو افراد کے ساتھ جلسہ گاہ میں آیا تھا۔ اس نے ڈائس کے قریب کرسیوں پر بیٹھنے کی کوشش کی تھی، جس پر اسے بتایا گیا کہ یہ کرسیاں عام سامعین کے لئے نہیں ہیں۔ سعد اکبر نے کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے معاوضہ کی پیش کش بھی کی تھی۔ جب میں نے انکار کر دیا تو وہ مایوس ہو کر اس جگہ چلا گیا، جو عام سامعین کے لئے مقرر کی گئی تھی۔

لیاقت علی خان کے پولیٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خان کا بیان بند کمرے میں لیا گیا۔ البتہ ان کے بیان کے چند حصے بعد میں شائع کئے گئے۔ بیان کے ایک حصے میں کہا گیا تھا کہ "لیاقت علی خان کو دھمکی آمیز خطوط ملتے تھے لیکن انہوں نے خطوط کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہ خطوط ضروری کارروائی کے لئے متعلقہ حکام کو بھیج دیئے گئے تھے"

تحقیقات ابھی جاری تھیں کہ سی آئی ڈی نے کمیشن کی کارروائیوں کو متاثر کرنے اور گواہوں اور ارکانِ کمیشن کو خوفزدہ اور ہراساں کرنے کے لئے ان کی نگرانی شروع کر دی۔ ۲۸ نومبر ۱۹۵۱ء کو کمیشن کے چیئرمین جسٹس منیر نے پنجاب کے ایڈووکیٹ جنرل کو بتایا کہ راولپنڈی میں ان کی قیام گاہ کو سادہ لباس میں ملبوس سی آئی ڈی والے گھیرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایڈووکیٹ جنرل کو حکم دیا کہ "وہ سی آئی ڈی والوں کو وہاں سے ہٹانے

کے انتظامات کریں ورنہ میں کمیشن کو لاہور منتقل کر دوں گا"

دو ملاقاتیوں نے جسٹس منیر کو بتایا کہ جب وہ ان سے ملاقات کرنے کے بعد باہر نکلے تو سی آئی ڈی والوں نے ان کا تعاقب کیا۔

قاتل کے بھائی مزدک، اس کی بیوی اور بیٹے دلاور خان کو بھی کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان سے چار گھنٹے تک سوالات کئے گئے۔ دلاور خان نے، جسے سعد اکبر اپنے ساتھ راولپنڈی لے گیا تھا، اپنے بیان میں کہا کہ "۱۴ اکتوبر کو مغرب کی نماز کے وقت ایک پٹھان گرانٹ مسلم پاکستان ہوٹل میں میرے باپ سے ملنے آیا تھا اور عشاء کی نماز کے وقت تک میرے باپ سے گفتگو کرتا رہا۔ وہ پٹھان میرے لئے اجنبی تھا"

ایس۔ ایچ۔ کیانی اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی صوبہ سرحد نے اپنے بیان میں بتایا کہ "مبینہ قاتل سعد اکبر نے ۱۱ جولائی ۱۹۵۱ء کو ایبٹ آباد کی ایک لائسنس یافتہ اسلحہ کی دکان سے پستول اور ۲۴ گولیاں خریدی تھیں۔ مبینہ قاتل کے پاس پستول کا لائسنس تھا۔ اسی پستول سے اس نے وزیرِ اعظم کو قتل کیا۔ قاتل کی دماغی کیفیت کے بارے میں ڈاکٹری رپورٹ نہیں ہے۔ البتہ بعد کی تحقیقات سے اس کے جنونی ہونے کا پتہ چلتا ہے"

حکومتِ پاکستان نے کمیشن کی تحقیقاتی رپورٹ کو شائع نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اخبارات کو گواہوں کے مکمل بیانات تک شائع



کمیشن کی راہ میں سی آئی ڈی رکاوٹ بن گئی

کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور بعض اوقات کمیشن کی کارروائیوں کو بھی شائع نہیں ہونے دیا گیا۔ بہانہ یہ کیا جاتا کہ اس کی اشاعت عوامی مفاد میں نہیں ہے۔ شاید حکومت کے نزدیک عوامی مفاد عوام سے بلند و بالا اور ارفع چیز تھی جسے عوام سے چھپایا جا رہا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے اعلان کیا کہ طیارہ تباہ ہونے کی وجہ سے لیاقت علی خان کے کیس کے تمام کاغذات جل گئے اور تحقیقاتی افسر اعزاز الدین بھی اس حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ حکومت اسپیشل پولیس کے دفتر سے ان کاغذات کی نقل حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن نجانے کن وجوہات کی بناء پر اس نے ایسا نہ کیا۔ اور اگر کاغذات کی نقل نہیں مل سکتی تھی تو حکومت کا فرض تھا کہ وہ از سرِ نو تحقیقات کرانے کے لئے کوئی دوسرا افسر متعین کرتی۔ لیکن اس نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اخبارات اور عوام نے حکومت کے اس رویہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

۱۷ اپریل ۵۳ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کو برطرف کر دیا۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ "خواجہ ناظم الدین کی حکومت ملکی مشکلات پر قابو پانے اور مسائل حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ امریکہ میں مقیم پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ کو نیا وزیر اعظم نامزد کیا گیا۔ مسلم لیگ نے گورنر جنرل کے اس آمرانہ اقدام اور محمد علی بوگرہ کی نامزدگی پر امنا و صدقنا کہا اور محمد علی بوگرہ کی اسمبلی میں حمایت کی۔ ۲۱ ستمبر ۵۳ء کو بوگرہ کو دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کا لیڈر منتخب کیا گیا اور ۱۷ اکتوبر ۵۳ء کو انہیں مسلم لیگ کا صدر بنا دیا گیا۔

بوگرہ کے زمانے میں بھی پاکستانی عوام نے لیاقت علی خان کی شہادت کی تحقیقات کرانے کا سوال اٹھایا۔ اخبارات نے اس سلسلے میں باقاعدہ ایک مہم چلائی۔ اور حکومت پر الزام لگایا کہ وہ ایماندار اور غیر جانبدارانہ تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے سے گریز کر رہی ہے۔ اس مہم کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ محمد علی بوگرہ نے یکم جنوری ۵۴ء کو ایک اخباری نمائندے کو بتایا کہ حکومت لیاقت علی خان کی شہادت کے معمہ کو حل کرنے کا عزم کر چکی ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ کے سراغ رساں ادارے ایف۔ بی۔ آئی کی خدمات حاصل کی جائیں گی، لیکن بعض حلقوں نے بوگرہ کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اور چند ہفتوں کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ تحقیقات کے لئے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سینئر افسر یورین کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ حکومت کے اس فیصلے پر پاکستانی



وزیر اعظم کے دل کے قریب سے خون بہہ رہا تھا!

اخبارات نے نکتہ چینی کی اور لکھا کہ آخر دنوں میں وزیر اعظم لیاقت علی خان برطانوی حکومت سے ناراض تھے۔ اس لئے ایک برطانوی افسر کی تحقیقات غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکتیں بہرحال حکومت نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا۔ یورین تحقیقات کرتا رہا۔ لیکن ایک قابلِ ذکر اور اہم بات یہ ہے کہ حکومت نے یورین کو گواہوں کے بیانات لینے کی اجازت نہیں دی۔ ایک صریح غیر متوقع طور پر اعلان کیا گیا کہ لیاقت علی خان کی شہادت کسی سازش کا نتیجہ نہیں تھی۔ یہ قاتل کا انفرادی فعل تھا۔ حکومتِ پاکستان نے یورین کی رپورٹ کو بھی خفیہ رکھا اور شائع کرنے کی اجازت نہیں دی۔

حکومتِ پاکستان کے اس اعلان سے بھی عوام مطمئن نہیں ہوئے۔ بیگم لیاقت علی اور ان کے بیٹے ولایت علی خان نے متعدد بار کہا کہ لیاقت علی خان کی شہادت میں ایک غیر ملکی طاقت کا ہاتھ کارفرما تھا۔

پاکستانی اخبارات، ڈان، جنگ، تعمیر، شہباز، انجام اور مغربی پاکستان نے الزام لگایا کہ مرکزی حکومت، لیاقت علی خان کی شہادت کی سازش میں ملوث غیر ملکی طاقت سے خائف ہے۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر حقائق کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی اثناء میں محمد علی بوگرہ کو وزارتِ عظمیٰ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ان کی علیحدگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کراچی کے عزیز الدین نے لکھا۔

"مسٹر محمد علی بوگرہ کی برطرفی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ لیاقت علی خان کی شہادت کا معمہ حل کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں امریکی ایف بی آئی کی خدمت حاصل کرنے کے لئے کوششیں کر رہے تھے۔"

اسی زمانے میں بیگم لیاقت علی خان کو سفیر بنا کر ہالینڈ بھیج دیا گیا۔ ان کی تقرری پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبارات نے لکھا کہ حکمرانوں نے بیگم صاحبہ کا منہ بند کرنے کے لئے انہیں سفیر بنایا ہے۔ بیگم صاحبہ جب اپنی میعاد ختم ہونے پر ہالینڈ سے کراچی آئیں تو انہوں نے لیاقت علی کی شہادت کی از سرِ نو تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا اور اپنے اس الزام کو پھر دہرایا کہ اس سازش میں غیر ملکی طاقت کا ہاتھ تھا۔ لیکن پاکستانی حکمرانوں نے اس مطالبہ پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ (باقی آئندہ)

افسانہ

سحر انیس

تاریخ کا فیصلہ

اُس دھرتی کا مظلوم ہاری تھا، **نیک محمدؐ** جہاں ایک بڑے پیر نما وڈیرے کے ظلم کا بول بالا تھا۔ اس علاقے کے ہاریوں اور کھیت مزدوروں کی حالتِ زار دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں تاریخ کے پہیہ کو آگے بڑھنے سے روکنے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے۔ اکثریت پر جبر کرنے والے ہاتھ وہاں بھی کام کررہے تھے۔ اس علاقے کے چپہ چپہ سے مظلوم لہو کی خوشبو آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا،

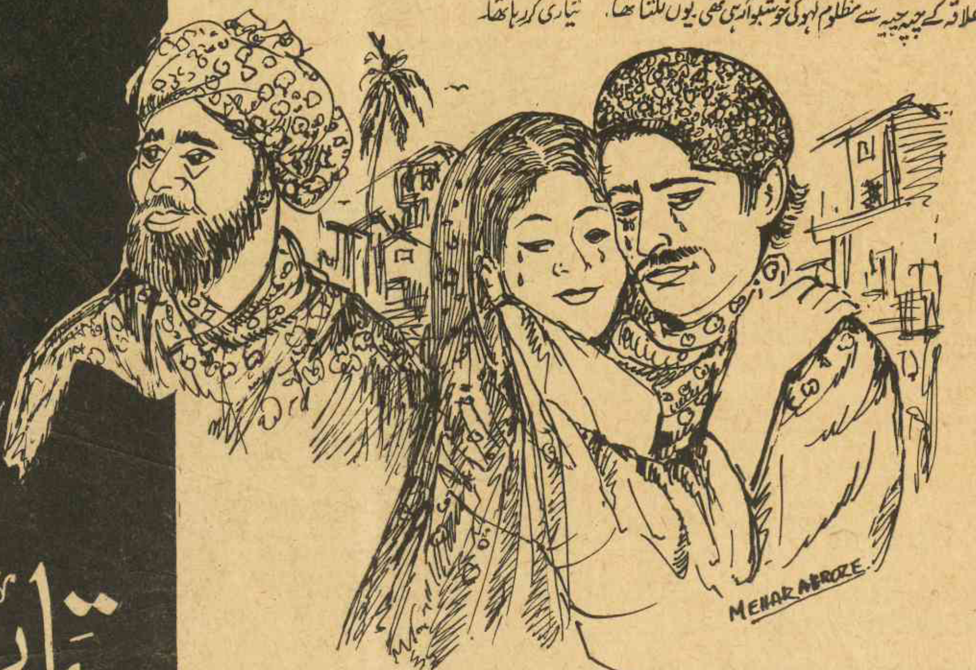
گوبر و مٹی سے لیپا پوچا ہوا کچا مکان تھا۔ جس میں نہ سردی سے بچنے کے لئے معقول انتظام تھا اور نہ گرمی سے بچاؤ کا کوئی بندوبست۔ ہر وقت ایسا لگتا تھا جیسے ابھی سورج نکلا ہی نہیں۔ اندر تو تاریکی تھی ہی۔ باہر جو سورج چمکتا تھا، اسے بھی سورج کہنے کے لئے مقدس پیر کی اجازت لازمی تھی۔ گویا باہر بھی تاریکی کے طویل سلسلے تھے۔

آقا اور غلام کے چکّے میں بے چارہ نیک محمد اور اس جیسے ہزاروں کسان درمیان میں پس رہے تھے۔

ایک دن فصلوں کے معائنہ کے لئے پیر صاحب تشریف لائے۔ نیک محمد اپنی لڑکی شادو کے ساتھ فصل کی کٹائی کی تیاری کررہا تھا۔

پیر صاحب جیسے اونچے لوگ تو دوسروں کی لڑکیوں کو بھی فصل سمجھتے ہیں۔ زمین کی طرح ہی ملکیت۔

شادو جس نے اپنے وڈیرے پیر کی کرامات اور تقدس کے کافی چرچے سنے تھے، ان کے اس غیر شائستہ عمل سے ایک دم سناٹے میں آگئی۔ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے باپ کی درانتی لے کر پیر صاحب کے پیٹ میں اتار دے۔ ٹھیک اسی وقت جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پیر صاحب اپنے چمچوں کے ساتھ رخصت ہوگئے۔ نیک محمد نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن شادو وسوسوں سے دوچار ہوگئی۔ گوٹھ کی عورتوں سے اس نے سنا تھا کہ پیر صاحب



جیسے نام نہاد مقدس پیر نما وڈیرے نے اپنے ناجائز اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مظلوم ہاریوں کے پوتر لہو کو ہزاروں من مٹی کے نیچے دبانے کی کوشش کی ہے۔

نیک محمد گندم کے کھیت میں ہل چلایا کرتا تھا۔ اس کے باوجود دو وقتوں میں سے ایک وقت اس کے گھر میں فاقہ ہوتا تھا۔ اور ایک وقت میں بھی جو کچھ اسے نصیب ہوتا، اس سے بس کسی طرح سانسوں کا کھیل جاری تھا۔ رہنے کے لئے

"نیک محمد"۔ ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ نیک محمد نے سر جو اٹھایا تو سامنے پیر صاحب کو اپنے حواریوں کے ساتھ کھڑا پایا۔ پیر صاحب ٹکٹکی باندھے شادو کو دیکھے جارہے تھے۔

"یہ میری لڑکی شادو ہے"۔ نیک محمد جلدی سے بولا۔

"اچھی ہے"۔ پیر صاحب پکتی ہوئی فصل کی بجائے شادو کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ شادو فصل نہ تھی، لیکن

جس لڑکی پر مہربان ہو جاتے ہیں اسے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنے بستر کی چادر کی طرح استعمال کر لیتے ہیں۔ اور استعمال کے بعد ۔۔؟ وہ اس سے آگے نہ سوچ سکی، کانپ کر رہ گئی۔ سامنے سورج غروب ہو رہا تھا اور نیک محمد گھر لوٹنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

دوسری صبح شادو کھیت پر نہیں گئی۔ شام کو نیک محمد گھر لوٹا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ دوڑ کر اپنے باپ سے لپٹ گئی۔

"وہ ! وہ تیرا سودا کرنا چاہتا ہے بیٹی۔" شادو ایکدم رو پڑی، ایسا نہیں ہو سکتا بابا۔ اس سے بہتر ہے کہ تم میرا گلا گھونٹ دو۔" نیک محمد نے سوچا شادو ٹھیک کہتی ہے۔ اسے کسانوں کی غیرت و حمیت کی روایت کو برقرار رکھنے کے لئے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ وہ ایک دم جذباتی ہو گیا۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شادو کا گلا گھونٹنا چاہا۔ شادو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو کے دو قطرے آنکھوں سے اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔

"کیا کر رہے ہو چاچا۔" نیک محمد کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ وہ چونک پڑا۔ سامنے اس کا بھتیجا دینو کھڑا تھا۔

"چاچا۔ مجھے پیر کے ناپاک ارادے کا علم ہے۔ تم ایک شادو کو جاگیردار کے ظلم سے بچانا چاہتے ہو، لیکن پورے دیس میں ان گنت شادائیں، جو ظلم و بربریت کا شکار ہو رہی ہیں، انہیں کون بچائے گا۔"

"دینو۔"

"ہاں چاچا۔" جرم جاگیردار کرنا چاہتا ہے، سزا تم شادو کو دے رہے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ تم استحصال کرنے والوں کے خلاف جدوجہد کیوں نہیں کرتے۔ کب تک مظلومیت کو گلے لگائے اس فرسودہ نظام کے نام لیواؤں کا سہارا بنے رہو گے۔"

"دینو! پھر تو نے الٹی سیدھی باتیں کیں۔"

"چاچا۔ یہ الٹی سیدھی بات نہیں۔ تاریخ کا تقاضہ ہے۔ تم اگر چاہتے ہو کہ تمہاری دھرتی کی عزت سلامت رہے، تمہاری بیٹیاں ظلم استحصال کرنے والے دیوتاؤں سے محفوظ رہیں، تو پھر ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر تم نے دوسرا راستہ اختیار کیا تو تمہارے کھیت، تمہاری دھرتی، تمہارا وطن، تمہاری بیٹیاں اپنی عصمت گنواتی رہیں گی۔ اور تم خاموش رہو گے۔ سوچ لو۔ ابھی وقت تمہاری مٹھی میں ہے۔ کل مٹھی کھولو گے تو وقت دور نکل گیا ہوگا۔ میں شادو کو اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ اور کل تمہارا فیصلہ سننے کے لئے میں تلسی گوٹھ کے آخری نکڑ پر

جرم جاگیردار کرنا چاہتا

ہے سزا شادو کو دے رہے ہو

شام چار بجے انتظار کروں گا۔ اور وہ دونوں چلے گئے۔

نیک محمد سوچنے لگا۔ لیکن اس کی سوچ اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا ۔۔۔ تاریکی کا اژدہا اسے نگلنے کے لئے قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ تاریکی کا اژدھا ۔ وڈیرہ پیر ۔ لیکن اس اژدھا کے جسم پر بنے ہوئے بیل بوٹے کتنے دلکش ہیں۔ اس کی شخصیت کتنی پوتر اور مقدس ہے۔ اس کی سب سنتے ہیں۔ کھیت بھی اس کے دم سے لہلہاتے ہیں۔ بارش بھی اسی کی بدولت ہوتی ہے۔ سورج بھی اپنی پہلی کرن اسی کی حویلی پر ڈالتا ہے۔ وہ اس سے بھاگ کر کہاں جائیگا۔ اس کے کھیت جنہیں اس نے خون سے سینچا تھا۔ اس کے پیداواری آلات، اسے کیا کہیں گے۔ یہی کہ جس کا نمک کھایا اسی کو دھوکہ دیا۔ لیکن نمک تو پیر وڈیرہ بھی اپنے آقا کا کھاتا ہے۔ پھر اس نے ایسی ذلیل حرکت کیوں کی۔ نہیں! نہیں۔ وہ اپنا خون کھیتوں کو دے سکتا ہے لیکن اپنے خون کا تقدس پامال نہیں کر سکتا۔ کھیت کی زندگی اس کے اپنے کردار کی عظمت سے ہے اگر وہ کچھ نہیں تو اس کے کھیت بھی کچھ نہیں۔ اسے بہرحال تاریخ کے ساتھ چلنا ہوگا۔

جب وہ صبح اٹھا تو اسے یوں لگا جیسے سورج کی پہلی کرن وڈیرہ پیر کی حویلی کی بجائے اس کے گھر کی دہلیز پر پڑی ہے۔ کھیت پر وہ بڑی دلجمعی سے کام کرنے لگا۔ کام کرتے کرتے دوپہر ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وڈیرے کے چمچے اسکے پاس آ دھمکے اس نے انہیں اپنا فیصلہ سنایا تو انکے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے اسی وقت اسے بیدخل کر دیا اور فوراً بعد اس کا گھر جلا دیا۔

گھر سے دھواں اٹھتا رہا۔ اور وہ تلسی گوٹھ جاتے ہوئے سوچنے لگا کہ دھواں جہاں سے اٹھ رہا ہے وہاں راکھ کے نیچے جو چنگاری دبی ہوئی ہے۔ اسے آگ کا بڑا شعلہ بننے سے بھلا کون روک سکے گا۔ اب تو وہ آزاد تھا۔ نہ اب پیر وڈیرے کا ہیبت ناک بت اس کا راستہ روکے کھڑا تھا، نہ فرسودہ نظام اور کہنہ رسم و رواج کی زنجیریں اسکے پیروں میں پڑی تھیں۔ زنجیریں ٹوٹ چکی تھیں۔ اس نے پیروں وڈیروں اور میروں کے خلاف اپنے مظلوم ہاری اور کھیت مزدور ساتھیوں کے ساتھ مل کر جنگ کرنیکا فیصلہ کر لیا تھا۔

دینو سچائی کا سمبل تھا۔

اس نے اسے راستہ دکھایا تھا۔ وہ راستہ جو انقلاب کی منزل کی طرف جاتا تھا۔ انقلاب۔ مزدور نظریہ کی روشنی میں کسان انقلاب۔ وہ تلسی گوٹھ کو جانے والی پگ ڈنڈی پر تیزی سے چلنے لگا۔ شام کے چار بجنے والے تھے۔ سورج کی روشن کرنیں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ اس نے سوچا بہت جلد وہ دن آئیگا جب اس دیس کا ہر ہاری، کھیت مزدور دینو بن جائیگا۔

بقیہ : جامعہ کراچی

آئے دن یونین کے معاملات میں مداخلت کرتے رہتے ہیں، اور اس کے کارکنوں کو نشانۂ ستم بناتے ہیں۔ کبھی یونین کے بعض ممبروں کو لالچ دیکر انہیں ایک متوازی یونین بنانے کے لئے اکساتے رہتے ہیں تو کہیں ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے ایک شخص کو ترقی دے کر اپنے دفتر میں متعین کر رکھا ہے۔ اسے وہ یونین توڑنے کیلئے بطور آلۂ کار استعمال کر رہے ہیں۔

اگر ڈاکٹر حفیظ زیدی یونیورسٹی کے محنت کشوں کی تنظیم کو توڑنے پھوڑنے کی کوشش کریں گے تو یونیورسٹی کی پرامن فضا متاثر ہونے کا احتمال ہے۔ اور نتائج کی ساری ذمہ داری ان پر ہو گی۔

پاکستان مزدور کسان پارٹی کی پہلی قومی کانگریس



طاہر خلیل

ہم نیپ کے جاگیرداروں کے "ممنون" ہیں

شیرگڑھ، مردان میں شمال کی جانب ایک چھوٹی سی منڈی اور معمولی آبادی کا اہم قصبہ ہے اسکی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ قصبہ کسانوں کی ہشت نگر تحریک کا اہم مرکز ہے۔ پاکستان مزدور کسان پارٹی نے اپنی پہلی کانگریس کے انعقاد کے لئے اس قصبہ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ کانگریس ۱۱ مئی سے شروع ہوئی اور پروگرام کے مطابق اسے ۱۴ مئی تک جاری رہنا تھا۔ لیکن عین وقت پر صوبہ سرحد کی حکومت نے اس علاقے میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کرکے کانگریس کو ناکام بنانے کی کوشش کی، جس کی بناء پر منتظمین کو عام جلسے اور کسان ریلی کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔

شیرگڑھ میں ۱۰ مئی سے ہی تہوار کا سا سماں بندھا ہے۔ نوشہرہ سوات روڈ اور ہری چند روڈ پر واقع چھوٹے بازاروں کو رنگ برنگی جھنڈیوں، سرخ رنگ کے ایک سفید ستارے والے جھنڈوں اور آرائشی محرابوں سے سجایا جا رہا ہے دکاندار اپنی اپنی دکانوں کے آگے خوش آمدید کے چھوٹے چھوٹے کتبے آویزاں کر رہے ہیں۔ گڑ منڈی جہاں یہ کانگریس منعقد ہو رہی ہے، کے وسیع و عریض صحن کو شامیانوں سے ڈھانپا جا رہا ہے۔ مندوبین اور مہمانوں کے بیٹھنے کیلئے فرش پر گھاس بچھائی گئی ہے۔

۱۰ مئی کے اخبار شہباز میں جو نیشنل عوامی پارٹی کا ترجمان ہے، صفحہ اول پر شہ سرخیوں کے ساتھ ایک خبر شائع ہوئی، جس میں بتایا گیا کہ مزدور کسان پارٹی کی کانگریس کے انعقاد سے شیرگڑھ میں زبردست خون خرابے کا خدشہ ہے۔ اس خبر میں ہشت نگر کے خوانین، ممبران سرحد اسمبلی، نیپ، جمعیت، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے گورنر سرحد سے اپیل کی ہے کہ وہ کسانوں کی کانگریس پر پابندی عائد کریں۔ ۱۰ مئی کو ہی رات گئے دفعہ ۱۴۴ کے تحت کانگریس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اور شیرگڑھ میں کسی قسم کے اجتماع کو غیر قانونی قرار دیدیا گیا۔ گورنر سرحد اسلم خٹک اس سے قبل پشاور کے جناح پارک میں منعقد ہونے والے زمینداروں اور خوانین کے جلسہ میں انہیں یقین دلا چکے تھے کہ حکومت سرحد زمینداروں کے مفادات کا پورا پورا تحفظ کرے گی۔ یہ جلسہ گزشتہ ہفتے انجمن تحفظ حقوق زمینداراں کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ اس پابندی کے باوجود مزدور کسان پارٹی نے کانگریس کے اجلاس کا فیصلہ کیا اور ۱۴ مئی کو منعقد ہونے والے جلسۂ عام اور کسان ریلی کے پروگرام منسوخ کر دیئے۔ سرکاری اہلکاروں اور خوانین کے پروردہ ایجنٹوں کی طرف سے یہ افواہ تیزی سے پھیلائی گئی کہ شیرگڑھ میں زبردست فائرنگ ہو رہی ہے۔ دو بسیں جو کسان کانگریس کے مندوبین کو لے کر جا رہی تھیں، خوانین قبائلی علاقے کی طرف لے گئے ہیں۔ ایسی افواہوں کا مرکز نوشہرہ تھا جہاں سے شیرگڑھ کو سڑک جاتی ہے۔ ان افواہوں کا مقصد مندوبین کو خوفزدہ کرنا اور انہیں کانگریس میں جانے سے روکنا تھا۔ لیکن مندوبین اور مبصرین کی بڑی تعداد جمعہ کی صبح کو پہنچ چکی تھی۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے مندوبین بھی پہنچ چکے تھے۔ "راشے پچہ دہ ہشت نگر سرہ ودرولی اکو" "ہشت نگر اگو سنگی کبنست"

جمعہ کی شام کو کانگریس کے پہلے سیشن کا آغاز ہوا، جس میں سرحد کے مندوبین نے شرکت کی۔ اس سیشن میں سرحد مزدور کسان پارٹی کے انتخابات مکمل کئے گئے۔ ان میں لالہ قادر خان صدر، مولوی صادق اور شیر علی بابا نائب صدر، فرید اللہ جنرل سیکرٹری، اظہر یوسف زئی اور محمد علی شاہ ایڈووکیٹ جوائنٹ سیکرٹری کے لئے منتخب ہوئے۔ اس اجلاس سے مزدور کسان پارٹی سرحد کے رہنماؤں نے خطاب

کانگریس کو سبوتاژ کرنے کیلئے ہر طرف افواہ پھیلا دی گئی

بھی کئے۔ رات کو ایک ثقافتی پروگرام پیش کیا گیا جس میں صوبہ سرحد کے کسانوں کے لوک گیت سنائے گئے۔ ۱۲ مئی کو پروگرام کا آغاز سوا دس بجے صبح ہوا جس کی صدارت میجر اسحاق محمد نے کی۔ قومی کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے صدر افضل بنگش نے اپنی تقریر میں کہا کہ مزدور کسان پارٹی کے قیام کو پانچ سال کا عرصہ مکمل ہو چکا ہے۔ گذشتہ ۲۵ سالوں سے ہم سرمایہ داری، جاگیرداری کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے روشن خیال طبقوں، سامراج دشمن اور جمہوریت پسند لوگوں کے متحدہ محاذ کے ذریعے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ لیکن گزشتہ طویل تجربے نے یہ بات ثابت کر دی کہ جدوجہد کے ایسے طریقے غلط تھے، اور متحدہ محاذ ایسے نہیں بنا کرتے، جیسے ہم گزشتہ ۲۵ برسوں سے بناتے آئے ہیں۔ اس عرصہ میں ہم نے جو بھی متحدہ محاذ بنائے، اس میں شامل لوگوں نے ہماری حیثیت کو صرف جلسے جلوس منعقد کرانے تک محدود رکھا۔ یہ لوگ ہمارے کندھوں پر آگے بڑھے، اور بعد میں اپنی طبقاتی منافرت کا اظہار کر دیا۔ نیپ اور عوامی لیگ کے متحدہ محاذوں سے نکلنے کے بعد ہم پر واضح ہوا کہ جب بھی سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور سامراج کے خلاف متحدہ محاذ بنا ہے، اس وقت محنت کشوں اور کسانوں کی ایک علیحدہ سیاسی جماعت نہیں تھی۔ اس سیاسی پارٹی کی تشکیل میں ہم نے جو کوتاہی کی ہے، وہ ہماری غلطی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نیپ کے جاگیرداروں کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمیں نیپ سے باہر نکالا۔ اس دھکے کے بعد ہماری آنکھیں کھلیں۔ اس طرح یکم مئی ۱۹۶۸ء کو مزدور کسان پارٹی کی پشاور میں تشکیل ہوئی۔ معروضی حالات کے پیش نظر یہ پارٹی اس وقت سندھ اور پنجاب میں منظم نہ ہو سکی۔ اس میں بھی ایک شخصیت کا ہاتھ رہا ہے، جو مزدوں کسانوں کا نام لے کر ہمیشہ ان کی جدوجہد کو سبوتاژ کرتا رہا ہے اس طرح سرمایہ داروں کے ایجنٹوں نے ہر مرحلہ پر ہمیں زک پہنچانے کی سازشیں کیں۔ ۱۹۷۰ء میں جمہوریت کے بحال ہوتے ہی پاکستان مزدور کسان پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی دن خوانین نے مزدور کسان پارٹی پر حملہ کر کے اس تحریک کی صورت میں بدل دیا۔ اس کے بعد اس تحریک کا رنگ کسانوں کے خون سے سرخ ہوتا گیا۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ چار برسوں کے دوران ساٹھ سے زائد کسان مرد اور عورتیں پولیس کی



گولیوں کا نشانہ بنے ہیں۔ جتنے بھی کسان اس تحریک میں شہید ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی زمین یا اپنے گھر میں نہیں مارا گیا بلکہ وہ اپنے کسی بھائی کی بیدخلی کے خلاف لڑتے ہوئے دوسری زمین پر مارا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم انتہا پسند ہیں۔ ہم نے کسانوں کو مروا دیا۔ ہم نے کسانوں کو مروایا نہیں بلکہ جدوجہد اور عمل کے انقلابی راستوں پر گامزن کیا ہے۔ اسی جدوجہد میں عظیم لینن، ماؤزے تنگ اور ہوچی منہ نے بھی اپنے کسان بھائیوں کی قربانیوں کو پیش کیا تھا۔ ہم انتہا پسند نہیں ہیں۔ بلکہ جب بھی کسانوں اور خوانین میں تصادم ہوا ہے، اس کی ابتداء خوانین کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہمیں اپنے دفاع میں گولی کا جواب گولی سے دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہشت نگر تحریک کسانوں کی خودرو تحریک ہے۔ جبکہ یہ خودرو تحریک نہیں، دراصل تاریخ میں پہلی بار کسانوں کو شعوری طور پر طبقاتی جدوجہد کا علم ہوا ہے۔

آج ہمارا نگر، تمہارا نگر، ہشت نگر ہشت نگر کا نعرہ تیزی سے گونج رہا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ کسانوں کی یہ تحریک صحیح ہے۔ گزشتہ پانچ سال سے ہم نے بہت جدوجہد کی ہے کہ تمام سامراج دشمن انقلاب کی

بائیں بازو کے تمام لوگ مل جل کر کام کرینگے

داعی تنظیموں سے رابطہ کر کے انہیں اس جدوجہد میں شامل کیا جائے۔ لیکن ہم اب تک اس مشن میں ناکام رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ عنقریب بائیں بازو کے ہمدرد، دانشور، سیاسی کارکن اور رہنما مل جل کر کام کرنے لگیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دشمن اپنا متحدہ محاذ مضبوط بنا رہے ہیں، اس لئے ہمیں بھی اپنے طبقاتی متحدہ محاذ کو مضبوط بنانا ہو گا۔ حال ہی میں سوات میں نیپ، جمعیت، جماعت اسلامی، اور مسلم لیگ کے خوانین نے مل کر ایک جرگے کی صورت میں سوات کی انتظامیہ سے مل کر مطالبہ کیا تھا کہ مزدور کسان پارٹی کی کانگریس پر پابندی عائد کر دی جائے۔ نیپ کے بعد پیپلز

تحریک کا رنگ کسانوں کے خون سے سرخ ہو گیا

پارٹی برسرِ اقتدار آگئی ہے۔اب حکومت ایک خان کے گھر سے نکل کر دوسرے خان کے گھر میں داخل ہو گئی ہے۔سات آٹھ دن پہلے خوانین نے پشاور میں اپنا کنونشن بلایا۔اس میں گورنر سرحد اور وزیرِ اعلیٰ کی کابینہ کے سب اراکین بھی گئے۔ انہوں نے وہاں جو کچھ کہا سب کو علم ہے۔نیپ کی حکومت میں تو دن میں چھاپے مارے جاتے ہیں، اور اب راتوں کو بھی ڈاکے ڈالے جاتے ہیں۔کسانوں کے مال مویشی لوٹ کر لے جاتے ہیں۔کسانوں کا سامان،خوراک کنوئں میں پھینک کر ضائع کر دیا جاتا ہے۔لیکن کسانوں کی جدو جہد آگے بڑھ رہی ہے۔اس سال صوبہ سرحد کے کسانوں نے بھی یومِ مئی منایا، اور سب سے بڑھ چڑھ کر منایا۔چارسدہ اور مالاکنڈ میں یومِ مئی کے سب سے بڑے اجتماعات منعقد کئے۔جدوجہد جس تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اسی تیزی سے طبقاتی دشمنوں کی صف بندیاں بڑھ رہی ہیں۔تیلہ بند کے مقام پر ایک کسان کے گھر میں موجود بیس ہزار روپے کا گڑ لوٹ لیا گیا۔ایک اور کسان کے بیٹے کی شادی سے ایک روز پہلے شادی کا سارا سامان لوٹ لیا گیا۔امیر جان آج بھی جیل میں پڑا ہے۔انہوں نے کہا کہ ۶۴-۱۹۶۵ء میں جب نیپ کے موجودہ آباؤ اجداد کی حکومت تھی تو کپڑے کا شدید بحران پیدا ہو گیا تھا۔لوگوں کو مردوں کے کفن کا کپڑا بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ اب ان کے بیٹوں کی حکومت آئی تو کفن تو در کنار یہ تو مردوں کو بھی کلے ٹھونک رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے دور میں کراچی کے مزدوروں کا قتل عام ہوا۔ داؤد خیل اور ملتان کے مزدوروں پر جو کچھ ہوا، اس سے عام انسان کی زندگی اجیرن بن کر رہ گئی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک عام تحصیلدار بھی اٹھ کر مزدور کو گولی مار دیتا ہے، تو اسے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ پٹ، خیل میں گزشتہ ہفتے ایک مزدور کو تحصیلدار نے گولی مار دی، لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

افضل بنگش نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ کیسا دورِ حکومت آگیا ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے کسانوں اور مزدوروں کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے۔گورنر کسانوں کو دھمکیاں دے رہے ہیں کہ ان سے نمٹ لیا جائے گا۔مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان مشکلات میں مزدور کسان پارٹی آگے بڑھ رہی ہے۔انہوں نے کہا کہ ہمارے سب سے بڑے دشمن ظالم جاگیردار، سرمایہ دار، اس کی حلیف نوکر شاہی اور ان سب کی پشت پناہی کرنے والا امریکی سامراج ہے۔ آج یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ پاکستان کا وجود رہے گا بھی یا نہیں؟ آج ہمارے دوست، دشمنوں کو دوستوں کے روپ میں پیش کرتے ہوئے شرم بھی محسوس نہیں کرتے۔شہنشاہ ایران پاکستان کے سب سے بڑے ہمدرد و غم گسار بن کر میدان میں آگئے ہیں۔ یہ کیسے ہمدرد ہیں، جو کہتے ہیں کہ "پاکستان کے ٹکڑے ہونے سے پہلے ہم اپنے دفاع کے لئے مناسب علاقوں پر قبضہ کر لیں گے"۔ ایسا ہرگز نہیں ہونے دیا جائیگا۔ ہماری حکومت شاہ ایران کے دفاع کے لئے بیانات جاری کر رہی ہے۔

افضل بنگش نے کہا کہ اگر پاکستان، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور نوکر شاہی سے عبارت ہے تو انہوں نے پہلے پاکستان کو ٹکڑے کر دیا ہے۔ بنگال کی تقسیم سے پاکستان کے ان ظالم طبقاتی حکمرانوں کے کرتوت کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ ہمارے ملک کی تقسیم کے ذمہ دار سرمایہ دار، جاگیردار اور نوکر شاہی ہے۔ پاکستان مزدوروں، کسانوں، نچلے طبقات اور محنت کشوں کا ہے۔ جب تک یہ طبقے زندہ ہیں، پاکستان زندہ رہے گا۔

متحدہ محاذ کے تجربے ناکام ثابت ہوئے

انہوں نے کہا کہ پاکستان، ایران اور افغانستان کے عوام کا آپس میں کوئی تضاد نہیں، وہ سب ایک ہیں۔ جب بھی ہمارے کسی بھی بھائی کو خواہ وہ ملک سے باہر ہی کیوں نہ ہو، ضرورت ہوئی تو ہم سے جو بھی مدد مانگی جائے گی ہم ایران اور افغانستان کے جمہوریت پسندوں کو ہر ممکن مدد دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں دائیں بازو کی گالیوں کا کوئی دُکھ نہیں ہے۔ بلکہ ان گالیوں سے ہمارا حوصلہ اور عزم جواں ہوتا ہے۔ ہمیں دُکھ ہوتا ہے جب بائیں بازو کے کچھ دوست ناعاقبت اندیشی میں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ان کے تیر بہت زیادہ دُکھ دینے والے ہوتے ہیں۔ پاکستان میں تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ دائیں بازو کا ہے جس کی رہنمائی جماعت اسلامی کر رہی ہے۔ یہ گروہ متحدہ محاذ کی شکل میں جمہوریت کا راگ الاپتے ہیں

کا راگ الاپتا رہتا ہے۔ آج مختار رانا، عثمان بلوچ، بادر خان جیل میں ہیں۔ رشید حسن خان کے وارنٹ ہیں۔ ان پر سختیاں کی جا رہی ہیں۔ جب کہ میاں طفیل کے مقدمات بھی واپس لے لئے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بورژوا جمہوریت کے قیام کے لئے جاگیرداری کا خاتمہ ضروری ہے۔ اس گروہ کی ساری سیاست مزدوروں اور کسانوں کے خلاف ہے، دوسرا گروہ درمیانی سوچ کا حامل ہے۔ جو پیپلز پارٹی کے نام سے جمع ہے۔ پیپلز پارٹی لاکھوں ایماندار سیاسی کارکنوں اور سوشلزم کے متوالوں کی جدوجہد سے بنی۔ اس گروہ نے جھڑا واوے او ہی کھاوے اور روٹی کپڑا، مکان کے نعرے دیئے۔ لیکن جب ان کی حکومت آئی تو زرعی اصلاحات، لیبر اصلاحات، تعلیمی اصلاحات دی گئیں۔ اور حکومت میں آنے کے بعد اپنے نعروں سے انحراف کرتے ہوئے، اس نے پوری قوت سے مزدوروں، کسانوں، اور طالبعلموں کو کچلا ہے۔ تیسری طاقت جو تیزی سے ابھر کر سامنے آ رہی ہے وہ سوشلزم کا آفاقی نظریہ رکھنے والے کارکنوں کی

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں)



۲۰ لاکھ روپے
طالرحمٰن
لو اور
۱۰ لاکھ روپے
رشوت دو!

14 کروڑ روپے

عطاالرحمٰن علوی کے ہاتھ کی صفائی

:- الفتح رپورٹ :-

میکلوروڈ سے گزرتے ہوئے ایک جگہ ایک بینر پر نظر پڑی۔ نمایاں الفاظ میں لکھا تھا۔ "بڑے بھائی عطاءالرحمٰن علوی نے ۱۴ کروڑ روپے ہضم کرلئے۔ چھوٹا بھائی اتنا ہی کھانے کے چکر میں ہے۔"

سرمایہ داروں اور بنکاروں کے متعلق سنتے آئے تھے کہ وہ غیر قانونی ذرائع سے عوام کا سرمایہ ہضم کرجاتے ہیں۔ کس طرح اور کیسے، اس کے متعلق حقائق کا کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ اس بینر سے میرے شبہے کو تقویت ملی۔ دل میں جستجو پیدا ہوئی کہ اس کی حقیقت معلوم کی جائے کہ یہ سرخی کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ تحقیقات کے بعد پتہ چلا کہ اس میں بہت کچھ حقیقت ہے۔ عطاءالرحمٰن علوی نے اپنی پوزیشن سے خوب فائدہ اٹھایا۔ عوام کے خون پسینے کی کمائی سے کروڑوں روپے نقد اور لاکھوں روپے کی جائداد کھڑی کرلی۔

عطاالرحمان علوی کے کارنامے

عطاءالرحمان علوی اسٹیٹ بنک میں بحیثیت خازن ۵۰ء سے تقریباً دس سال تک مامور رہے۔ اس مدت میں انہوں نے بنکاری کے ذریعہ امیر بننے کا منصوبہ تیار کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے گرگِ باراں دیدہ کی طرح اسٹیٹ بنک کی متعدد ہستیوں کو کسی نہ کسی طرح اپنے جال میں پھالنسا۔ اپنے تعلقات اور پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کواپریٹو بنک قائم کیا۔ جس کا نام انہوں نے اسٹینڈرڈ کواپریٹو بنک رکھا۔ اس کے پہلے چیرمین مسٹر مائت تھے۔ اس کاروبار کو چلانے کے لئے انہیں تجربہ کار آدمیوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے اسٹیٹ بنک کے مسٹر عبدالحمید اور مسٹر وی۔ آئی۔ پٹھان دونوں کی غیر سرکاری خدمات حاصل کیں۔ علوی اور پٹھان میں یہ زبانی معاہدہ ہوا کہ وہ دونوں مستقبل میں اس بنک یا اور جو بھی کاروبار کریں گے، آدھے آدھے کے حصہ دار ہوں گے۔ یہ علوی کے منصوبے کا پہلا مرحلہ تھا جسے بڑی کامیابی کے ساتھ انہوں نے مکمل کرلیا۔ جب بنک چلنے لگا تو مسٹر علوی نے دیکھا کہ اگر مسٹر پٹھان کو اس سے وابستہ رہنے دیا گیا تو ان کی ناجائز آمدنی میں کمی واقع ہوگی۔ ویسے بھی اب مسٹر پٹھان کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ کیونکہ بنک اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا تھا۔ چنانچہ اپنے منصوبے کے دوسرے مرحلے کو یوں پورا کیا کہ انہوں نے مسٹر پٹھان کو عضو معطل کی طرح کاٹ کر الگ کردیا۔ چونکہ مسٹر پٹھان اس وقت اسٹیٹ بنک اور بنک آف بہاولپور کے ملازم تھے، اس لئے مسٹر علوی کی سازشوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔ اور مسٹر علوی کے تیر سینے پر کھا کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔

اس کے بعد بنک کے چیرمین مسٹر مائت کی باری آئی۔ اور انہیں بھی چیرمین کے عہدے سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا گیا۔ ان کی جگہ بنک کے نئے چیرمین پیر محفوظ کو بنا دیا گیا جو ۷۰ء تک اپنے عہدے پر برقرار رہے۔ مسٹر علوی نے اپنا تیسرا اور

اسٹیٹ بنک کے حکام نے مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا

آخری مرحلہ مکمل کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی انعام الرحمٰن کو ایم ڈی بنا کر خود چیئرمین بننا چاہا۔ چنانچہ پیر محفوظ کا بھی وہی حشر ہوا جو ان سے قبل مسٹر مائنت کا ہوا تھا۔ اس ڈرامے کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب پیر محفوظ کو برطرف کیا گیا تو ان کی خدمات کے صلے میں الوداعی تقریب بھی نہ ہونے دی گئی۔

جولائی ۱۹۷۰ء میں جب مسٹر عطاء الرحمٰن علوی کو اسٹیٹ بنک کے ڈائریکٹرشپ اور اسٹینڈرڈ بنک کی چیئرمینی سے الگ کیا گیا تو انعام الرحمٰن نے پیر محفوظ کو دوبارہ بنک کا چیئرمین بنادیا۔

عطاء الرحمان علوی کی بدعنوانیاں

مسٹر علوی کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب کوئی ضرورت مند آتا اور قرضے کی سہولت مانگتا تو وہ صرف اس کو قرضہ دیتے جو ان کی شرائط پوری کرنے پر تیار ہو جاتا۔ اگر کسی کو دس لاکھ روپے کی ضرورت ہوتی تو وہ بنک سے اس کے نام پر ۲۰ لاکھ روپے قرضہ دلاتے۔ دس لاکھ ضرورت مند کو دے دیتے اور بقیہ دس لاکھ اپنے پاس رکھ لیتے کواپریٹو بنک کے دوران انہوں نے جن پارٹیوں کے ذریعہ دولت حاصل کی ان میں فردوس ٹریڈنگ کارپوریشن کے مالک مسٹر نثار اور مسٹر عزیز اللہ حسن ریٹائرڈ سی۔ ایس۔ پی ہرچینا گروپ شامل ہیں۔ تحقیقات کے بعد پتہ چلا کہ مسٹر علوی نے مبینہ طور پر مسٹر نثار کے اکاؤنٹ سے تقریباً دس لاکھ روپے نکلوائے اور ہرچینا کے گروپ سے تقریباً ۲۵ لاکھ روپے حاصل کئے، اور عزیز اللہ حسن سے تقریباً ۱ لاکھ روپے لئے۔ چنانچہ مسٹر نثار احمد نے ہائیکورٹ میں جو مقدمہ دائر کیا ہے، اس میں یہی بات کہی گئی ہے۔ اسی طرح جب مسٹر عزیز اللہ حسن سے مارشل لاء اتھارٹی کے تحت ریکوری ہوئی تو انہوں نے انکشاف کیا کہ مسٹر علوی نے اپنے ذاتی استعمال کے لئے روپے نکلوائے تھے۔

اروکی کیمیکلز، گلبرگ ٹیکسٹائل، ریاض اور خالد فشریز۔ ان تینوں اکاؤنٹس میں سے تقریباً ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے قرضے دیئے گئے جس میں سے تقریباً ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے خود مسٹر علوی نے اپنے ذاتی استعمال کے لئے حاصل کئے۔ یہ ایڈوانس کسی سیکورٹی کے بغیر منظور کیا گیا۔ طرفہ تماشا یہ کہ ہر موسم میں اسٹیٹ بنک سے کاؤنٹر فنانسنگ لی جاتی تھی اور ہر سال اسٹیٹ بنک کے اڈیٹر اسٹاک چیک کرتے تھے، لیکن کبھی بھی اسٹیٹ بنک کو بدعنوانی کی رپورٹ نہیں کی گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسٹر علوی نے اسٹیٹ بنک کے بعض اعلیٰ حکام کو اپنے فریب میں پھانس رکھا تھا۔ اور ان کی ہمدردیاں حاصل کر رکھی تھیں۔ چنانچہ ایسے مواقع پر یہ تعلقات کام آتے اور ان کی بدعنوانیوں پر پردہ ڈال دیا جاتا۔ اس طریقہ سے ایک شخص الور پیر بھائی جس کو کوئی بنک پانچ لاکھ روپے دینے کے لئے تیار نہیں تھا، کروڑوں روپے کا ایڈوانس مسٹر علوی کی شرائط پر دیا گیا۔ مسٹر علوی نے اس میں سے تقریباً ۷۵ لاکھ روپے ذاتی استعمال کے لئے لئے۔

> **انعام الرحمٰن کے بارے میں**
>
> انعام الرحمٰن کے دور میں کیا ہوا؟ اس سلسلے میں تفصیلات جمع کی جا رہی ہیں۔ قارئین کرام کے پاس جو اطلاعات ہوں، ان سے ہمیں آگاہ کیا جائے۔

اور انور پیر بھائی کو دیوالیہ قرار دلوا دیا۔ اب وہی پیر بھائی ان کے دفتر میں تین ہزار روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ انہیں اس ڈر سے ملازم رکھا گیا ہے کہ کہیں وہ پول نہ کھول دیں۔

اسی طرح سے آدم لمیٹڈ کو ایک کروڑ ۲۴ لاکھ روپے کا ایڈوانس دے کر اس میں سے تقریباً ۶۵ لاکھ روپے غتر بود کر دیئے گئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا اس کا ثبوت کیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت مسٹر انعام الرحمان علوی پر چلنے والا مقدمہ ہے جس کا سب سے اہم سوال ہے کہ ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے کہاں سے ٹرانسفر کیا۔ عوام بدعنوان بنکار سے یہ بھی سوال کریں گے کہ انہوں نے العطاء ٹیکسٹائل کہاں سے لگوائی۔ ان کی لاکھوں روپے کی جائداد، سینکڑوں پلاٹ اور محل کہاں سے آیا۔ ظاہر ہے یہ تمام چیزیں اُگتی نہیں، اور نہ ہی آسمان سے ٹپکتی ہیں۔ مختصر مدت میں ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ بدعنوانیوں کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔ کروڑوں روپے نقد اور لاکھوں روپے کی جائدادیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ مسٹر علوی نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ دولت کی ہوس میں تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور ہر وہ کام کیا جو اخلاق اور قانون کی نگاہوں میں جرم ہے۔

اسٹیٹ بنک سے سوال

ہم اسٹیٹ بنک سے سوال کرتے ہیں کہ مسٹر علوی کو نکالنے سے پہلے حکام نے جن کے علم میں یہ تمام باتیں تھیں، قانونی چارہ جوئی کیوں نہیں کی موصوف کی بدعنوانیوں کی باز پرس کیوں نہ کی گئی۔ اور اتنے عرصے تک ان دھاندلیوں پر پردہ کیوں پڑا رہا۔؟

ہم سوال کرتے ہیں کہ علوی کے پاس کنٹرولنگ شیئر کہاں سے آئے۔؟ ہوسکتا ہے کہ حکومت کی نظروں میں مسٹر علوی مجرم نہ ہوں، لیکن عوام کی نظروں میں ان کا جرم ثابت ہو چکا ہے۔ یہ شخص یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے کہ "میرے سر پر اتنے گنڈے ہیں لیکن کوئی شخص ایک بھی توڑ کر دکھائے۔"

علوی اور یحییٰ خان

عطاء الرحمٰن علوی، یحییٰ کے مصاحب خاص تھے۔ یحییٰ خان کے لئے رنگین راتوں کا اہتمام کرتے تھے۔ شب طرب سجاتے تھے، ساغر و مینا کا انتظام کرتے تھے۔ علوی نے فلیش مین ہوٹل راولپنڈی میں کمرہ نمبر ۱۳۸ اپنے لئے محفوظ کروا رکھا تھا۔ اسے بطور خاص سجایا گیا تھا۔ اس کمرے میں ایک طرف بار (شراب خانہ) تھا، دوسری طرف آراستہ و پیراستہ بیڈروم تھا۔ یہاں عام طور پر اعلیٰ سول حکام اور یحییٰ کے ہمنوا فوجی افسر آتے تھے۔ مگر جس روز یحییٰ خان کو آنا ہوتا تھا اس روز یہاں کسی اور کا داخلہ ناممکن تھا۔ یہ سلسلہ اس وقت سے جاری تھا جب یحییٰ خان بریگیڈیر تھے۔ فلیش مین ہوٹل کے اس کمرے سے ملکی اور غیر ملکی خواتین بھی نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

سامراجی ممالک اس سال کثرتِ پیداوار کے شدید بحران کا شکار ہیں۔ جس کی وجہ سے انکے ہاں اقتصادی اور معاشی بحران بڑھ گیا ہے۔ اس بحران کی وجہ سے تضاد کے بڑھ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ ممالک اپنے بحران کا بوجھ ایشیا افریقہ اور لاطینی ملکوں کے عوام پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ ترقی پذیر ممالک کی معیشت میں مشکلات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ سامراجیوں کے اس خود غرضانہ "اقدام کی ایشیا، افریقہ اور لاطینی ملکوں کے عوام کو زبردست مزاحمت کرنی چاہیئے۔

فاضل اشیاء پیدا کر کے دوسرے ملکوں کے لئے بحران پیدا کرنا، سرمایہ دارانہ ممالک کا پرانا ہتھکنڈہ ہے۔ البتہ امریکہ کی افزائشِ سرمایہ کی اجارہ داری موجودہ سال میں سرمایہ کی منڈی میں کافی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ اب امریکہ اپنی اشیاء کی کھپت کے لئے ایشیا، افریقہ اور لاطینی ملکوں کو کبھی استعمال نہیں کر سکتا۔ امریکہ کی اشیاء برآمدات ایشیا، افریقہ اور لاطینی ملکوں میں ۱۹۷۰ء میں کل ۱۲۹۹۰ ملین ڈالر تھی، جو کہ ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔

امریکہ کی ترقی پذیر ممالک کے لئے اشیاء کی پیداوار کی شرح ۷۰ء میں ۱۵٫۶۳ فیصد تھی جو کہ ۱۹۶۹ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ امریکہ کی برآمدات کی نسبت مجموعی شرح پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ (۱۹۷۰ء میں ۶۹ء کے مقابلے میں ۱۳٫۷ فیصد اضافہ ہوا ہے۔)

فاضل صنعتی اشیاء کی پیداوار کی برآمدات، فروخت کا ایک بنیادی حصہ تھی۔ مذکورہ برآمدات میں صنعتی اشیاء کی فروخت سے حاصل شدہ زائد سرمایہ شامل ہے۔ اقوام متحدہ کی جاری کردہ شماریات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں سرمایہ دار ممالک سے ترقی پذیر ممالک کو برآمد کی جانے والی مشینیں اور نقل و حمل کے آلات کی رقم کا تناسب ان ممالک کو برآمدات کی مجموعی رقم کا ۴۱ فیصد رہا جبکہ دوسری صنعتی اشیاء کی برآمدات مجموعی برآمدات کا ۲۸ فیصد رہا۔ زائد زرعی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی میں بھی اضافہ ہوا۔ زرعی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی جو سرمایہ دارانہ ممالک میں کی گئی، اس نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے دیہاتوں میں ایسی آفات پیدا کیں جن کا اظہار نہیں کیا جا سکتا

سامراج اپنے اقتصادی بحران کا بوجھ ترقی پذیر ممالک پر ڈال دیتا ہے

فوچینگ ین

ترجمہ: عبدالمجیب خاں

ہے، ان ملکوں کا دیوالیہ ہو گیا۔ قابلِ کاشت زمین بیکار ہو گئی اور کسانوں کی ایک بڑی تعداد مفلوج ہو کر رہ گئی۔

ترقی پذیر ممالک پر مکمل کنٹرول اور ان کا استحصال، اور فاضل اشیاء پیدا کر کے ان کے لئے مشکلات پیدا کرنا سامراجیوں کا پرانا ہتھکنڈہ ہے۔ ان کی طاقت کے سکہ کی وجہ سے ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک طویل عرصہ ان کی پیداوار پر بھروسہ کرتے رہے، اور صرف ایک یا دو قسم کے خام مال اور زرعی پیداوار کی اشیاء کو برآمد کر کے اپنی قومی معیشت مستحکم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس طرح یک فصلی معیشت کی وجہ سے یہ ممالک آسانی سے سامراجیوں کی سرمایہ دارانہ اجارہ داری کے جال میں پھنستے چلے گئے۔

۶۳ فیصد ربر یہ زمین سے حاصل کرتے ہیں۔ ملائیشیا نے ان سے زرعی اجناس کا فاضل حصہ خریدنے سے انکار کر کے ان کے لئے مشکلات پیدا کر دیں۔ ۹۰ فیصد بیرونی تجارت کا یہ پٹرولیم کی صنعت سے حاصل کرتے ہیں۔ وینزویلا کچھ برآمد نہیں کر سکتا البتہ بڑی مقدار میں ماہی گیری اور صنعتی سامان سرمایہ دارانہ ممالک سے درآمد کرتا ہے۔ ۷۰ فیصد ناریل گھانا برآمد کرتا ہے۔ ۶۸ فیصد کافی کولمبیا برآمد کرتا ہے۔ ۳۰ فیصد کاٹن مصر برآمد کرتا ہے۔ ۶۶ فیصد چائے سری لنکا برآمد کرتا ہے۔ ان اعداد و شمار کو دیکھتے ہوئے سامراجی اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ وہ کس طرح اپنے بحران سے چھٹکارا حاصل کریں۔

خام معدنیات کی قیمت گرا دینا، سرمایہ دارانہ ممالک کے لئے ایک عام بات ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اسی طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے اپنی جان بخشی کرتے ہیں۔

عالمی سرمایہ دارانہ منڈی میں بنیادی اشیاء کی قیمت دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے کئی مرتبہ بحران کا شکار ہوئی جس کی وجہ سے دنیا کو کئی بار شدید بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۹ء میں امریکہ میں معاشی بحران پیدا ہوا، جس میں ربر کی طلب کم ہو گئی۔ جس کی وجہ سے آٹوموبائل کی صنعت میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اسی طرح ربر سے متعلق دیگر صنعتیں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ سے صرف قدرتی ربر کی فاضل پیداوار تھی۔ اور دوسری طرف سامراجی اپنے اسٹاک میں اضافہ کر کے ربر کی قیمت کو گرانا چاہتے تھے۔ جس کا اثر یقینی طور پر ترقی پذیر ملکوں کی پیداوار پر تباہ کن ہوتا۔

ملائیشیاء کی ربر کی برآمدی قیمت کے اعداد و شمار کو لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۶۳ء میں ۸۰ فیصد تھی۔ ۶۹ء میں ۹۶ فیصد۔ ۷۰ء میں ۷۸ فیصد۔ ۷۱ء میں ۶۴ فیصد اور ۷۳ء میں گر کر ۵۴ فیصد رہ گئی۔ اتنی تیزی سے ربر کی قیمت میں کمی، یقیناً ترقی پذیر ممالک کے لئے زبردست نقصان ہے۔ ان کی سب سے بڑی مثال ہمارے سامنے ملائیشیا کی ہے۔ جس کی ربر کی برآمدات میں ۷۰ء کے مقابلے میں ۶۹ء میں

فیصد اضافہ ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۶۹ء کے مقابلے میں ۱۴ فیصد کم آمدنی ہوئی۔

سامراجی ہمیشہ سرمایہ کو پھیلا کر، برآمدی اشیاء میں اضافہ کرتے ہیں اور اس طرح برآمدی سرمائے کی دو صورتوں میں تشکیل کرتے ہیں۔ ایک طریقہ براہِ راست سرمایہ کاری ہے، جس سے ترقی پذیر ممالک کے معدنی ذرائع اور زرعی پیداوار مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور دوسرا طریقہ منڈیوں پر اجارہ داری قائم کرنا ہے۔ براہِ راست سرمایہ کاری کر کے ترقی پذیر ملکوں میں آجرانہ عمل کی تشکیل کرتے ہیں اور اشیاء کی فروخت ہوتی ہے۔ سامراجی مال کے محصول کی فہرست میں آجاتے ہیں، اور برآمدات کو فروغ دیتے ہیں۔ بیرونی ترسیلِ نقدی قائم ہو جاتی ہے۔ اس طرح بہت سے ممالک اپنی تجارت اور قومی صنعتوں سے محروم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نقل و حمل اور انشورنس میں بھی بچت ہوتی ہے۔ غیر ملکی کمپنیوں کے مقابلے میں گھٹیا مال استعمال کر کے براہِ راست منڈیوں کو کنٹرول کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں خاصا نفع کماتے ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں امریکہ کی غیر ممالک میں سرمایہ کاری کی اجارہ داری میں ۱۰ فی صد سالانہ شرح سے اضافہ ہوا ہے ۷۱ء کے اختتام پر ۸۶۰۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ چکی تھی۔ جس کا ۲۷ فیصد ترقی پذیر ملکوں میں لگایا گیا۔ یعنی ۱۹۶۰ء کے مقابلے میں یہ کئی گنا زیادہ ہے۔

دوسرا طریقہ ریاست کی سامراجی اجارہ داری کا دو طرفہ اور کثیر الاطراف امداد کا وسیع جال ہے جس سے سرمایہ دارانہ ممالک اپنا فوجی اور سیاسی مقاصد، فاضل اشیاء کو فروخت کر کے حاصل کرتے ہیں۔

شماریات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۴۵ء کے وسط سے ۷۱ء کے وسط تک امریکہ کی مجموعی غیر ملکی امداد ۱۴۹۶۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔ اس طرح سود کی حد میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ جو ممالک بھی قرض لیتے ہیں وہ امریکہ سے پرانی اور آؤٹ آف ڈیٹ مشینیں اور پرزے خریدنے کے پابند ہوتے ہیں، اور ان کی قیمتیں بین الاقوامی منڈی کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔

امریکہ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کل امداد کا ۵۰ فیصد امریکہ کی تیار کردہ اشیاء کی صورت میں دیا جاتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس امداد کا ایک بڑا حصہ رسل و رسائل اور الیکٹرک پاور کے شعبوں میں استعمال کرنا ہوتا ہے، جو کہ سامراجی اجارہ داری کے لئے بہت ضروری ہے، تاکہ ترقی پذیر ممالک کی معیشت کو تباہ کیا جائے۔ اور اپنی فاضل اشیاء ان کو فروخت کی جائیں۔

نئے مالی بحران سے پیدا شدہ نقصان کو سامراجی تیسری دنیا کے ملکوں سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی سب سے جیتی جاگتی مثال ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کے زرمبادلہ کے محفوظات میں نقصان سے ظاہر ہوتا ہے جو کہ سامراجی دنیا میں مالی بحران کی وجہ سے رونما ہوا ہے۔ ۷۱ء کے آخر میں سرمایہ دارانہ ملکوں کے سونے اور کل غیر ملکی زرِمبادلہ کے محفوظات ۱۲۹۸۰۰ ملین ڈالر تھے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کے محفوظات ۲۲۷۸۰ ملین ڈالر تھے، جس میں ۴۵٫۱۹ فیصد زرِمبادلہ امریکی ڈالر کی صورت میں شامل تھا۔ جب ڈالر کی

خود انحصاری

سامراج کے خلاف

ایک مؤثر

ہتھیار

قیمت گری تو سامراجیوں نے اس نقصان کا سارا بوجھ ترقی پذیر ممالک پر ڈال دیا۔ خاص طور پر وہ ممالک جن کے پاس زرمبادلہ ڈالر کی صورت میں محفوظ تھا۔ وہ اس کا سب سے زیادہ شکار بنے۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں ڈالر کی قیمت گرنے سے ایشیا، افریقہ اور لاطینی ملکوں کے زرِمبادلہ کے محفوظات میں ۱۲۰۰ ملین ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

۷۳ء کے اوائل ہی سے سامراجی دنیا میں مالی بحران شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ جس کا نشانہ ایک بار پھر ڈالر بنا، اور جس کے نتیجے میں دوسری بار ڈالر کی قیمت گری۔ اس طرح ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بہت سے ملکوں کے زرمبادلہ کے محفوظات متاثر ہوئے اور ابھی تک یہ ممالک اس نقصان کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔

مالی بحرانوں کا اثر ہمیشہ ترقی پذیر ملکوں کی تجارت پر پڑا ہے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے تقریباً ایک چوتھائی ممالک امریکہ کو اشیاء برآمد کرتے ہیں۔ ۷۱ء میں ترقی پذیر ملکوں نے تقریباً ۱۵۰۰۰ ملین ڈالر کی اشیاء برآمد کیں۔ اس طرح ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کو امریکہ سے برآمدات میں، ڈالر کی قیمت گرنے سے ۱۲۰۰ ملین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔

نام نہاد نئی معاشی پالیسی سے حکومتِ امریکہ نے اگست ۷۱ء میں پیدا شدہ مالی بحران کے بوجھ کو ایک نئے انداز سے دوسروں کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ ایک میکسیکن ماہرِ معاشیات کے اندازہ کے مطابق حکومتِ امریکہ کی درآمد کردہ اشیاء پر زائد سرچارج کی وجہ سے لاطینی ملکوں کو ۱۵۰۰ ملین ڈالر کا نقصان صرف امریکہ سے برآمدات کی صورت میں ہوا۔ جس میں میکسیکو کے نقصان کا تخمینہ ۴۸ ملین ڈالر تھا۔

ڈالر کی قیمت گرنے کے بعد جو ممالک ۱۹۷۱ء کے مالی بحران کے بعد سے دوسری کرنسی کو زرمبادلہ کے طور پر استعمال کر رہے تھے، ان ترقی پذیر ملکوں کے غیر ملکی قرضے میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو گیا۔

سیکرٹریٹ کے تیسرے اجلاس پر وہ اعداد و شمار شائع کئے گئے ہیں جن کو اقوامِ متحدہ کی تجارت اور ترقی پذیر کانفرنس میں تخمینہ لگایا گیا ہے۔ اس کے مطابق ترقی پذیر ممالک کو مجموعی طور پر ۲۵۰۰ ملین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔

سامراجی ملکوں کی توسیعِ زر کی خود غرضانہ پالیسی اور اپنے معاشی و مالی بحران میں دوسروں کو گھسیٹنا، اور ترقی پذیر ملکوں کے عوام میں مایوسی پھیلانا، ان کی ترقی میں روڑے اٹکانا ان کا سب سے گندہ ہتھکنڈہ ہے۔

تیسری دنیا کے اتحاد اور قوموں کی یک جہتی کا نعرہ بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں موضوعِ بحث بن چکا ہے۔ ان تمام ملکوں کو جو بنیادی اشیاء کی برآمدات پر بھروسہ کرتے ہیں، انہیں چاہیئے کہ وہ سامراجی معیشت کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو جائیں۔



فوجی شوگر ملز کھوسکی میں کیا ہو رہا ہے؟

ڈاکخانہ کی عمارت میں پولیس کی چوکی بٹھا دی گئی

-: کامریڈ عبدالرحمان خان :-

فوجی شوگر ملز کھوسکی کے تقریباً ۵۰۰ ملازم اور انکے اہل و عیال متواتر چھ ماہ سے بیروزگاری کی وجہ سے پریشانیوں اور فاقہ کشی کا شکار ہیں۔ ان تباہ حال ملازمین میں سے بیشتر افراد سے ہمیں ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جو لرزہ خیز واقعات انہوں نے بتائے ہیں وہ ہر پاکستانی شہری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ملکی قانون موجودہ افسر شاہی اور سرمایہ داری کے ہاتھوں کس قدر مجبور ہے۔ قوموں کی تعمیر ایک طویل عمل ہے۔ جب تک قوم کے ہر فرد میں یہ احساس پیدا نہ کیا جائے کہ ہم سب ایک ایسی منزل کی طرف جا رہے ہیں جہاں استحصال، جبر، ناانصافی اور مایوسی نام کی کوئی شے نہیں ہوگی، اس وقت تک کسی قومی ترقی کی امید رکھنا فضول ہوگا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کو برسرِ اقتدار لانے میں ایسے ہی استحصال زدہ طبقوں کا ہاتھ ہے۔

فوجی شوگر ملز ایک تجارتی ادارہ ہے۔ یہاں کے ملازم تجربہ کار، باشعور، محبِ وطن پاکستانی ہیں۔ لیکن جو سلوک ان کے ساتھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے، ثابت کرتا ہے کہ انکے خلاف دھونس، دھاندلی اور ظلم کا اندھا دھند اور بے رحمانہ استعمال ہوا ہے۔ معاملات کو سمجھ کر سلجھانے کی بجائے افراد کو کچل کر معاملات ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ علاج غیر فطری ہے۔ ڈی۔ پی۔ آر کا استعمال ان محنت کشوں کے خلاف کیا گیا ہے، جن کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے تشدد، غنڈہ گردی اور حق تلفی کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ جنہوں نے سینکڑوں روپے کی تاریں اور رجسٹرڈ عرضداشتیں حکومت کے ہر چھوٹے بڑے افسر کو بھیجی تھیں، اور جو آخر وقت تک پُرامن رہے۔ لیکن ان کی متواتر چیخ و پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ کوئی غیر جانبدارانہ تحقیق نہ کرائی گئی۔

ڈی۔ پی۔ آر کا استعمال ان عناصر کے خلاف ہونا چاہیئے تھا جنہوں نے یونین کو توڑنے کے لئے اور مزدوروں کی سرکوبی کے لئے ڈنڈا مار پارٹی کی تشکیل کی جس نے غنڈہ عناصر کو باہر سے درآمد کیا۔ جنہوں نے تحریری معاہدات کو پس پشت ڈال کر لوگوں کی صریحاً حق تلفی کر کے صوبائی تعصب کو ہوا دینے کی احمقانہ کوشش کی۔ جنہوں نے قومی مفاد کی بجائے اقرباپروری کی۔ کھاد، تقاوی قرضہ جات اور ملازمتوں کو سیاسی رشوت کے طور پر استعمال کیا۔ ڈی۔ پی۔ آر کا استعمال اس انتظامیہ پر ہونا چاہیئے تھا جس نے یونین کے عہدیداروں کو کئی مقدمات میں ملوث کر دیا۔ پھر قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان کے لئے چندہ کی فراہمی بند کر دی اور یونین کے معاملات میں ناجائز دخل اندازی کی۔ ضمانتوں پر دباؤ ڈالا۔ غیر منتخب نمائندوں کو خود ہی نامزد کر کے مزدوروں پر مسلط کر کے ٹریڈ یونین کا مذاق اڑایا۔ ان غیر منتخب اور غیر نمائندہ افراد کے ذریعہ یونین کا مقفل دفتر کھلوا کر تمام ریکارڈ اور قیمتی اشیاء کو خورد برد کرا دیا تاکہ مزدور اپنے دفاع میں کوئی ریکارڈ نہ پیش کر سکیں۔ ڈی۔ پی۔ آر، کا استعمال اس جنرل منیجر پر نہیں ہو سکا جس نے یونین کے عہدیداروں کو کھلم کھلا ایسے الفاظ میں دھمکی دی جس سے ہماری جانباز افواج اور صدر قوم کے خلاف مایوسی پیدا ہو۔ جس نے مذاکرات کے درمیان غنڈوں کو نکالنے کے عوض یونین کو اپنے آئندہ سیزن کے مطالبات نہ پیش کرنے کی یقین دہانی مانگی۔

ملز انتظامیہ کے یہ سارے اقدامات صنعتی بدامنی پیدا کرنے کے حقیقی اسباب ہیں۔

ہمیں بہت سے ورکروں کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا ہے اور یہ معلوم کر کے مایوسی پیدا ہوئی ہے کہ فوجی شوگر ملز کھوسکی کے مزدوروں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ جنرل منیجر اور انتظامیہ کے چند دیگر افراد کا طرزِ عمل سخت متشددانہ ہو چکا ہے۔ پہلے تو انہوں نے خود غیر آئینی اقدامات کے ذریعہ مزدوروں میں بے چینی پیدا کی اور پھر دور از قیاس الزامات لگا کر نوکر شاہی، پولیس اور محکمہ محنت کی ملی بھگت سے انہیں بے رحمی سے کچلا گیا۔ یونین کے عہدیداروں کے خانگی سامان مقررہ معیاد سے بہت قبل کوارٹروں سے نکال کر ملز گیٹ سے باہر پھینک دیئے۔ گرفتار شدہ عہدیداروں کے اہل و عیال کو کوارٹروں سے جبری بیدخل کر دیا گیا۔ گیٹ پاس بند کر دیئے گئے۔ مار پیٹ کروائی گئی۔ ملز میں استبداد کا دور دورہ ہے۔ معمولی معمولی تکالیف کے ازالہ کے لئے کوئی محنت کش فریاد کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مزدوروں کو ان کے جائز حقوق سے زبردستی محروم کر دیا گیا ہے۔ اوور ٹائم لیا جا رہا ہے لیکن معاوضہ طلب نہیں کر سکتے۔ ملازمت کا کوئی تحفظ نہیں ہے۔ صفائی کا موقعہ دیئے بغیر ملازمتوں سے نکالا جا رہا ہے۔

اتنی آبادی کے باوجود ڈاکخانے کا کوئی بندوبست نہیں لیکن اسی عمارت میں پولیس بٹھا دی گئی ہے۔ انتظامیہ کا طرزِ عمل ایک فاتح لشکر کا سا ہو چکا ہے اور مزدور اپنے آپ کو بیگار کیمپ میں محسوس کرتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

بقیہ عطاالرحمن علوی

علوی اور یحییٰ کی دوستی کا ذکر چلا ہے تو ایک قصہ سن لیجئے۔

مسٹر محمد احمد زبیری نے عالمی بنک کے نائب صدر مسٹر محمد شعیب کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا۔ شرکا میں جمال میاں فرنگی محلی، ڈان کے سابق ایڈیٹر جمیل انصاری، ولیکا، جمیل الدین عالی، محمد علی رنگون والا، وائی۔ ایچ۔ شیرازی، ایس۔ یو۔ درانی، پی پی آئی کے مظم علی اور عطاء الرحمن علوی بھی شامل تھے۔ جمال میاں فرنگی محلی وضع دار بزرگ تھے۔ ایک دوسرے کا احترام، رکھ رکھاؤ اور وضعداری مشرقی تہذیب کا خاصہ ہے۔ مگر عطاء الرحمن علوی کو دولت کا نشہ تھا۔ یحییٰ کی دوستی اور مصاحبی نے اسے دو آتشہ بنا دیا تھا۔ اس لئے جب وہ عشائیہ میں تشریف لائے تو انہوں نے سب حضرات سے ہاتھ ملانے اور بات کرنے میں اپنی توہین جانی اور نہایت رعونت کے ساتھ اپنا سر اکڑائے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ جمال میاں فرنگی محلی نے علوی کی رعونت کو سب سے زیادہ محسوس کیا، لیکن وہ خاموش رہے۔ تھوڑی دیر بعد ڈنر شروع ہونے کا اعلان ہوا۔ سب شرکا ڈنر کی ٹیبل کی طرف بڑھے اور پلیٹیں لینے لگے۔ جب عطاء الرحمان علوی پلیٹ اٹھا چکے اور کھانے کی میز پر بھی اپنی رعونت کا مظاہرہ کیا تو جمال میاں فرنگی محلی بولے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے عطاء الرحمن علوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”علوی! شاہ کے مصاحب ہم بھی رہے ہیں، مگر یہ اترانا اور پرانے رشتوں کو بھلا دینا کم ظرفی ہے“۔ عطاء الرحمن علوی ایسی بات سننے کی توقع نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے انتہائی غصے میں آکر پلیٹ زمین پر پھینکی اور فوراً ہال سے نکل گئے۔ اس بدتہذیبی پر ایک دم سب چونکے اور ساتھ ہی جمال میاں پر دل کا دورہ پڑ گیا۔

بقیہ مزدور کسان پارٹی

عظیم قوت ہے۔ اس ضمن میں عوامی سطح پر ابھی تنظیم مکمل نہیں کی جا سکی۔ انہوں نے کہا کہ مزدور کسانوں پارٹی پر الزام ہے کہ ہم پیپلز پارٹی کی ذیلی شاخ ہیں جب کہ پیپلز پارٹی نے ہمیں کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہوں نے کہا کہ اس مرحلے پر بائیں بازو کے تمام کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ متحد ہو کر آگے بڑھیں اور اپنی انقلابی ذمہ داریاں پوری کریں اور ان عناصر کا بھی صفایا کریں جو سوشلزم کا نام لے کر انقلاب کو کاروبار بنائے ہوئے ہیں۔

انہوں نے اپنی تقریر کے آخر میں ”الفتح“ کو بھی شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا کہ ”الفتح“ نے ہمیشہ محنت کشوں میں اور کسانوں کی طبقاتی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ جب بھی مزدوروں اور کسانوں پر مصیبت کا وقت آیا ہے ”الفتح“ ان کا ہمدرد بن کر آگے آیا ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر مندوبین اور مبصرین سے اپیل کی کہ وہ عوامی تحریک اور عوامی جمہوری انقلاب کی راہ میں کام آنے والے شہیدوں کی یاد میں ایک منٹ کے لئے خاموش کھڑے ہوں۔ اس کے بعد ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ اس کے بعد مزدور کسان پارٹی کے جنرل سیکرٹری غلام نبی کلو نے تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اس اجلاس میں مردان سے قومی اسمبلی کے رکن عبدالخالق خان بھی مزدور کسان پارٹی کے مندوب کا ٹکٹ سینے پر آویزاں کئے ہوئے تھے۔ جس پر مندوبین میں سے بیشتر معترض اور حیران تھے۔ کیونکہ بطور مبصر ان کی شرکت پر اعتراض پیش کیا جا سکتا تھا۔ اس اجلاس سے اگلے روز یعنی ۱۳ رمئی کو بھی خالق خان پورے سیشن میں بطور مندوب شریک رہے۔ اس دن پارٹی کے بہت سے مندوبین میں خالق خان کی یوں اچانک شمولیت پر خاصا تناؤ اور کھچاؤ کی کیفیت رہی جب کہ ملک سے باہر سے آنے والے مہمانوں کو جو کانگریس میں بھی شامل ہوئے تھے بطور مبصر شمولیت کی اجازت دی گئی تھی۔ ۱۳ رمئی کو بھی مزدور کسان پارٹی کی کانگریس کا اجلاس پولیس فرنٹیئر کانسٹیبلری، سکاؤٹس اور لیوی کی مسلح سنگینوں کے سائے میں شروع ہوا۔ مسلح دستے اس عمارت کو دور دور تک گھیرے میں لئے ہوئے تھے جہاں یہ اجلاس ہو رہا تھا۔ اخبارات میں خبر آ چکی تھی کہ مالاکنڈ کے علاقے تھانہ میں خوانین اور کسانوں میں زبردست فائرنگ جاری ہے۔ اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ پیپلز پارٹی تھانہ کے صدر، عہدیدار اور دوسرے بے شمار کارکن کسانوں کی طرف سے فائرنگ کرنے کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ اخبارات میں تنگی، بٹ خیلہ اور ہاتھیاں میں کسانوں اور خوانین کے مسلح تصادم کی خبریں بھی آ چکی تھیں اس لئے اس دن خاصی دہشت اور خوف و ہراس کی فضا طاری رہی۔

اس اجلاس میں ملک کی سیاسی صورتِ حال پر میجر اسحاق محمد نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان اور قیام پاکستان سے پہلی صورتِ حال کا تفصیل سے جائزہ لیا۔

میجر اسحاق کی تقریر کے بعد پاکستان مزدور کسان پارٹی کی مرکزی کونسل کا انتخاب ہوا۔ اس انتخاب میں صرف مندوبین نے حصہ لیا۔ جس کے مطابق میجر اسحاق محمد صدر، شیر علی باچہ مرکزی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے ہیں۔ لالہ قادر اور غلام نبی کلو نائب صدر اور امتیاز عالم، شفیع حسین جوائنٹ سیکرٹری کیلئے منتخب ہوئے۔ اشفاق مرزا کو پروپیگنڈہ سیکرٹری کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس رپورٹ کے بعد مندوبین اور مبصرین کے ساتھ پولیس کی سنگینیں بھی سمٹ رہی تھیں۔ اس طرح مزدور کسان پارٹی کی پہلی قومی کانگریس ۱۳ رمئی کے دھندلکوں میں اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

بقیہ پردہ چاک

قبول نہیں کریں گے۔“

اس واقعہ کے تیسرے روز اخبارات میں ایک ”ننھی منی“ خبر شائع ہوئی۔ ”اساتذہ کی سنیارٹی لسٹ منسوخ کر دی گئی۔ صوبائی وزیر تعلیم کا اعلان“۔ اگر کوئی اور مسئلہ ہوتا، اپوزیشن کو گالیاں دینی ہوتیں یا کسی ”عظیم تر منصوبے“ کا اعلان ہوتا تو یقین کیجئے یہ خبر کم از کم پانچ کالمی ہوتی اور صوبائی وزیر کا ایک عدد ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ بھی چھپا ہوتا۔ چونکہ معاملہ ”پسپائی“ کا تھا، اس لئے بہت چھوٹی سی خبر اخبار کے ایک کونے میں دبی ہوئی تھی۔ صوبائی وزیر تعلیم نے لسٹ کو منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ اساتذہ کی سنیارٹی کا صحیح تعین کیا جائے۔ اس معاملہ کو کلیتاً نوکر شاہی اور ان مٹھی بھر مفاد پرستوں کو نہ سونپا جائے جو اس معاملے کو کھٹائی میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور اس بات کی سازش کر رہے ہیں کہ اساتذہ کی سنیارٹی لسٹ شائع نہ ہو سکے۔ اس طرح وہ اساتذہ میں بحران کو جنم دے کر تعلیمی پالیسی کو مکمل طور پر ناکام بنانا چاہتے ہیں۔

بقیہ فوجی شوگر ملز

یونین کے عہدیداروں نے بتایا کہ یونین متواتر ایک سال سے عرصہ سے سندھ گورنمنٹ کے ہر چھوٹے بڑے افسر، وزیر اور ممبر اسمبلی کو مختلف عرضداشتیں اور تاریں بھیجتی رہی ہے، جس میں واضح الزامات کے تحت منصفانہ تحقیقات کی اپیلیں کی گئی تھیں لیکن کسی کونے میں بھی شنوائی نہ ہوسکی۔ مزدور رہنماؤں نے ہمیں مزید بتایا کہ مزدوروں نے اپنی تمام جدوجہد میں مکمل ملک دوستی اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا ہے لیکن اس کے برعکس انتظامیہ نے سخت غیر آئینی اور جابرانہ اقدامات کئے۔ یہ وہ فیکٹری ہے جس کی حفاظت مزدوروں نے خود کی۔ اگرچہ ان کے نظم و ضبط کو ہر طرح سے آزمائش میں ڈالا گیا لیکن ان کی طرف سے کوئی غیر قانونی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس کے باوجود ان کے خلاف جو اقدامات کئے گئے ہیں وہ انسانی اقدار کی پامالی کی ایک دلخراش داستان ہے۔

مزدور رہنماؤں کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ ان تمام ستم زدہ مزدوروں کو واپس ڈیوٹی پر لیا جائے، تمام واقعات کی صحیح خطوط پر چھان بین کرائی جائے اور اصل ملزموں کو خواہ وہ کیسی حیثیت کے ہوں، کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ تاکہ محنت کش جو قوم کا فعال اور اہم حصہ ہیں، کسی بددلی، مایوسی اور عدمِ اطمینان کا شکار نہ ہو جائیں۔ عوام میں یہ احساس پیدا ہو جانا طاقتور ظالم قانون کی گرفت سے محفوظ ہے اور اس کے مقابل انصاف کا حصول ممکن نہیں ہے، ایک تشویشناک رجحان ہے۔ قوانین صرف اسی وقت فائدہ مند ہو سکتے ہیں جبکہ ان کے نفاذ کے لئے طرفین میں سے کسی کو بھی دقت پیش نہ آئے۔ جہاں یہ حالت ہو کہ تین ورجن ملازم اور ان کے بال بچے فاقہ کشی پر مجبور ہوں اور درجن بھر مزدور رہنما چھ ماہ سے متعدد مقدمات میں ملوث ہوں اور ان کے مالی امداد کے ذرائع بھی بند کر دیئے جائیں، وہاں مظلوم کے لئے حصولِ انصاف کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا فوری نوٹس لینا حکومت کا اولین فرض ہے۔ اب سیزن ختم ہو رہا ہے لہٰذا کھوسکی شوگر ملز کے موجودہ جنرل منیجر اور پرسونل منیجر کو یہاں سے تبدیل کر کے ان سنگین واقعات کی مفصل طور پر منصفانہ تحقیقات کرائی جائے۔

بقیہ الفتح کا نیوز پرنٹ

مجھے یقین ہے کہ الفتح ان آمرانہ اقدامات سے مرعوب نہیں ہوگا کیونکہ الفتح اور مظلوم عوام نے مل کر جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اس کی تکمیل ابھی باقی ہے۔ الفتح اور عوام منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔

الفتح کا دکھ، عوام کا دکھ ہے۔ الفتح کروڑوں مظلوم عوام کا اخبار ہے، مظلوم کی زبان ہے۔ اس لئے وہ نوکر شاہی، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے عوام دشمن اور ملک دشمن کرتوتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہی بات حکمرانوں کو ناگوار گزرتی ہے کیونکہ انہوں نے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ اس گٹھ جوڑ نے غریب اور متوسط طبقے، کسانوں اور مزدوروں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔

میں الفتح کے کارکنوں کو تعاون کا یقین دلاتا ہوں، عوام الفتح کے ساتھ ہیں۔ آپ ہر صورت میں الفتح جاری رکھیں اور ضرورت کے وقت بے شک قیمت میں اضافہ کر دیں۔

(غلام محمد شاہانی۔ عمر کوٹ)

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
4 - 21 JUNE - 1973

سڑکوں کی طاقت نے ۔ ۔ جون کو یوم شہدا منانے کا اعلان کیا، اقتدار کے منبر سے کہا گیا، پاکستانی مزدورو! تم یوم مئی منا سکتے ہو شکاگو کے شہدا کو نذرانہ عقیدت پیش کر سکتے ہو لیکن اپنے ملک میں جون کے شہدا کی یاد سے اپنے دلوں کو نہیں گرما سکتے، شہید چوک میں جلسہ نہیں ہو سکتا کیٹرک ہال میں جلسہ کرو، اگر ہمارا حکم نہ مانا گیا تو ریاستی طاقت تم سے نمٹ لے گی۔ چنانچہ منگھوپیر اور لانڈھی کورنگی کے صنعتی علاقوں کو پولیس اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔

اس موقع پر مزدوروں نے اپنے اعلیٰ اور پختہ سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا اور ریاستی طاقت کو اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ ایک مرتبہ پھر انکے خون سے ہولی کھیلے۔ انھوں نے ، جون کے شہدا کی قبروں پر عقیدت کے پھول نچھاور کئے اور عہد کیا کہ آخری فتح تک جدوجہد جاری رہے گی اس موقع کی یہ تصویر اس بات کا ثبوت ہے کہ محنت کشوں کے بچے بھی اپنے دشمنوں کو پہچان چکے ہیں اور وہ اپنے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کرنے کا پختہ عزم رکھتے ہیں ۔

